

سائنس کی کتاب

ڈاکٹر اسرار احمد



مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اسے کتابچے کے طباعت و اشاعت کے ہر شخص
کو کھلی اجازت ہے

۵۵۰۰	اکتوبر ۱۹۸۳ء	بار اول
۱۱۰۰	دسمبر ۱۹۸۳ء	بار دوم
۵۵۰۰	مارچ ۱۹۸۶ء	بار سوم
۵۵۰۰	جنوری ۱۹۸۷ء	بار چہارم
۲۲۰۰	مئی ۱۹۸۹ء	بار چہارم
	ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن	ناشر
	مکتبہ جدید پریس - لاہور	مطبع

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ————— / ۶ روپے

عام ایڈیشن ————— / ۳ روپے

مقام اشاعت ————— ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۶۰۰۳ - ۸۵۶۰۰۴

کراچی آفس ————— نمبر ۱۱ اداؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی

فون: ۲۱۶۵۸۶

پجری سال نو

اور

ساختہ کریلا

انہ

ڈاکٹر اسرار احمد



ترتیب و تسوید (شیخ) جمیل الرحمن

مع

کریلا کی کہانی

حضرت ابو جعفر محمد باقر کی زبانی

ترجمہ از مولانا عطاء اللہ صنیف بھوجیانی

تقدیم

حسن اتفاق سے یکم محرم الحرام ۱۴۰۲ھ یعنی پندرہویں صدی ہجری کے دوسرے سال کا 'نوروز' جمعہ کا دن تھا۔ اس مناسبت سے ڈاکٹر المراد احمد صاحب نے مسجد دارالسلام، باغ جناح، لاہور میں اپنے خطاب جمعہ میں جو اہم باتیں اٹھا کر فرمائیں وہ ماہنامہ 'میشاق' میں 'ہجری سالِ نو مبارک' کے عنوان سے شائع ہو گئی تھیں۔

پھر اسی سال ۸ محرم الحرام کو ڈاکٹر صاحب نے مسانحہ کر بلا، کا تاریخی پس منظر، کے عنوان سے مفصل خطاب فرمایا جو 'میشاق' بابت دسمبر ۸۱ء میں شائع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی واقعاتِ کر بلا کے ضمن میں ایک طویل روایت کا ترجمہ بھی شائع کر دیا گیا تھا جو حضرت زین العابدین علی بن حسین کے صاحبزادے اور حضرت جعفر صادق کے والد ماجد حضرت محمد باقر سے مروی ہے۔

'میشاق' کی اس اشاعت کی مانگ بہت زیادہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اب اس کا کوئی نسخہ دفتر میں موجود نہیں ہے، چنانچہ احباب کے تقاضوں کے پیش نظر اب ان تینوں کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

توقع ہے کہ ان شاء اللہ العزیز یہ کتابچہ ان مغالطوں اور غلط فہمیوں کے ازالے میں مدد و معاون ثابت ہوگا جو ماہ محرم الحرام اور شہادتِ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ضمن میں عوام و خواص میں پائی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق کو پہچاننے اور اسے ذہناً و قلباً قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ہجری

سَالِ نَوْمُ بَارِكِ

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جمعہ کادت اور محرم الحرام
۱۴۰۲ھ کی یکم تاریخ تھی۔ اس روز مسجد
دارالسلام، باغ جناح، لاہور میں محترم
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے خطاب
جمعہ میں جو موضوع گذشتہ دو ماہ سے چل
رہا تھا یعنی 'نظام سیاست و حکومت سے متعلق
قرآنی تعلیمات' اس پر گفتگو سے قبل نئے ہجری
سال کے آغاز کی مناسبت سے جو کچھ فرمایا وہ درج
ذیل ہے (مرتب)

تَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ - اَمَّا بَعْدُ
فَاعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي سُورَةِ الْبَقَرَةِ : وَلَا تَقْرُلُوا الْمَنَ يُقْتَلُ
فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلَاكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۱۵۲)
وَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِي سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ : وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ
قَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (۱۶۹)

جس کی صحت پر امام بخاری اور امام مسلم جیسے جلیل القدر محدثین اتفاق کر رہے ہوں اور جس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کے چچا زاد بھائی ہیں اور جو گویا حضرات حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے رشتے کے چچا بھی ہیں اور نانا بھی۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضرت مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہود ۱۰ محرم الحرام کو روزہ رکھتے ہیں تو آپ نے یہود سے دریافت فرمایا کہ ”تم یہ روزہ کیوں رکھتے ہو“ انہوں نے بتایا کہ ”یہ دن ہمارے لئے بڑی خوشی کا دن ہے۔ اس لئے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو آل فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو جو تعاقب میں تھا غرق کیا تھا لہذا ہم شکرانے کے طور پر یہ روزہ رکھتے ہیں، اس پر آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ ”تمہاری نسبت (حضرت موسیٰ کے ہم زیادہ حق دار ہیں“ یہود نے تو اس کو ایک قومی دن کا درجہ دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ تو دین اسلام کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور دین اسلام کی تاریخ تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ اسی موقع پر آنحضرت نے فرمایا کہ ”ہم اس دن کا روزہ رکھنے کے زیادہ حق دار ہیں“ چنانچہ اس وقت سے آنجناب نے دس محرم الحرام کا روزہ رکھنا شروع فرما دیا۔

ویسے بھی اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارے دین میں ”شہادت“ کا معاملہ کوئی رنج و غم والی بات ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک مرد مومن کے لئے فوز و مرام اور فلاح و کامرانی کا بلند ترین اور ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ دلیل کیلئے سورۃ البقرہ کی آیت ۱۰۴ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ”یعنی جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں مردہ نہ کہو، بلکہ یہ لوگ (توحقیقت میں) زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور حاصل نہیں۔“ اور سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۹ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ”یعنی جو لوگ اللہ

کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس سے روزی پائے ہیں، کو پیش نظر رکھیے۔ ان مقتولین کی برزخی زندگی میں حیات اور اس میں رزق پانے کی کیفیات امور غیب سے متعلق ہیں لہذا اس کا کوئی تصور و شعور اس عالم ناسوتی میں ہمارے لئے ممکن نہیں۔

شہادت فی سبیل اللہ وہ سعادت عظمیٰ اور چوٹی کا وہ عمل ہے کہ جس کے لئے انبیاء و رسول علیہم السلام تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں منقول ہیں ایک یہ کہ اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ شَہَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ اور دوسری یہ کہ اللّٰهُمَّ اَرْزُقْنِیْ شَہَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ مزید برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی احادیث میں منقول ہے:

وَالَّذِیْ نَفْسٌ مَّحْمُودَةٌ لَوْ دَدَّتْ اَنْ اُعْزُو فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَاَقْتُلْ شَہْرًا اُعْزُو فَاَقْتُلْ۔ ”اس (اللہ) کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے میری آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں“ یہ سنت رہی ہے کہ رسول قتل نہیں ہوتے چونکہ عالم ظاہری میں اس طرح رسول کی مغلوبیت کا پہلو نکلتا ہے۔ لیکن اس سے مرتبہ شہادت کے رفیع و مہتم بالشان ہونے کا اندازہ لگائیے۔ علاوہ ازیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی سن لیجئے کہ ”جس مسلمان کی موت اس حال میں آئی کہ اس کے دل میں راہ حق میں سرکٹا کر سرخرد ہونے کی تمنا و آرزو نہ ہو، اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوئی“ پس شہادت ہرگز رنج و الم سوگ اور ماتم کرنے والی چیز نہیں ہے۔

اگر شہادت رنج و غم اور الم و ماتم والی شے ہوتی تو دور نبوی اور دور خلافت راشدہ کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جس میں کوئی نہ کوئی عظیم شہادت وقوع پذیر نہ ہوئی ہو۔ اگر شہادت میں رنج و غم اور ماتم کا پہلو تلاش کریں تو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت کا دن بھی ماتم کے دن کے طور پر منانا ہوگا۔ یہ بڑی عظیم شہادت ہے۔ توحید کے لئے یہ پہلا خون بہا ہے۔ جس سے مکہ مکرمہ کی زمین لالہ زار ہوتی ہے اور کس بہیمانہ طریقے پر کہ

ابو جہل نے تاک کر اندام نہانی پر نیزہ مارا ہے جو پشت کے پار ہو گیا ہے۔ پھر ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظیم شہادت ہے جس کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ ابو جہل اور اس کے اشقی القلب ساتھیوں نے حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پیروسیوں سے باندھے پھر چار سمت میں چار اونٹ کھڑے کر کے یہ رسیاں اونٹوں کی ٹانگوں سے باندھ کر ان کو ہانک دیا گیا اور حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرچھے اٹھ گئے۔ یہ شوہر اور بیوی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے جرم میں اس ظالمانہ طور پر شہید کئے گئے۔ ان کی مظلومانہ شہادت کے واقعات ایک حساس دل کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ اگر ہمیں سوگ اور ماتم کا دن منانا ہوتا تو ان کا مناتے! اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی بنیاد پر شہادت کا دن فوتہ و گریہ اور ماتم کا کوئی پہلو رکھتا تو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا دن اس کا کہیں زیادہ مستحق ہوگا کہ اسے سوگ کا دن منایا جائے جن کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت داری کے تہرے بلکہ چوہرے رشتے ہیں چنانچہ چچا بھتیجے کا رشتہ بھی ہے۔ خالہ زاد بھائی بھی ہیں اور رضاعی بھائی بھی ہیں۔ عرب میں رضاعت کا رشتہ بالکل خونی رشتے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کی حرمت جس طرح رحم اور خون کے رشتوں کی بنیاد پر ہے اسی طرح رضاعت کی بنیاد پر بھی ہے۔ پھر ساتھ کے کھیلے ہوئے ہجول ہیں۔ مزید اضافہ کیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کے مطابق اسد اللہ بھی ہیں اور اسد رسول بھی ہیں۔ پھر نعش مبارک کا حال یہ ہے کہ اعضاء بریدہ (مٹا شدہ) ہے۔ شکم چاک ہے۔ کلیجہ نکال کر چبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اگر ہر سال سوگ کا دن منایا جاتا اور ماتم کیا جاتا تو ان کی شہادت پر کیا جاتا۔ پھر دیکھئے کہ حضرت زید بن حارثہ حضرت جعفر طیار ابن ابی طالب حضرت عبداللہ ابن رواحہ حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بے شمار دوسرے جاں نثاران محمد صلی اللہ علیہ وسلم دور نبوت میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ سوگ کا دن منایا جاتا تو ان کا منایا جاتا۔ لیکن

رنج و غم کی بات کون سی ہے!! اسلام کی تاریخ کا کون سا دور ہے جو ان شہادتوں اور قربانیوں سے خالی ہو۔ اسلام کے گلشن میں ہر چہار طرف یہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ پھر غور فرمائیے کہ اسلامی تقویم کا جو پہلا دن ہر سال آتا ہے۔ یعنی یکم محرم الحرام تو یہ ایک عظیم شہادت کا دن ہے۔ یعنی دوسرے خلیفہ راشد امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا دن یکم محرم الحرام ہے۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے“ اگر رنج و غم کے اظہار کا مستند ہوتا اور اگر سوگ کا دن منانے کا معاملہ ہوتا تو آج کے دن ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ۲۸ ذی الحجہ کو ہوا تھا جس میں آنجنابؓ مجروح ہوئے تھے اور معتبر روایات کے مطابق ان کی وفات یکم محرم الحرام کو ہوئی تھی۔ پھر ۱۸ ذی الحجہ کو تیسرے خلیفہ راشد ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تقریباً پچاس دن کے محاصرے کے بعد انتہائی مظلومانہ طور پر شہید کئے گئے جن کی شہادت کے نتیجے میں مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوئے اور امت میں ایسا تفرقہ پڑا کہ آج تک ختم نہیں ہوا۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو اس ”شہید مظلوم“ کی شہادت کے دن کو منایا جاتا۔ پھر ۲۱ رمضان المبارک کو سید اللہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور کے چچے بھائی، آپ کے داماد، چوتھے خلیفہ راشد شہید کر دیئے گئے جو حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے والد ماجد بھی ہیں۔ سوگ کا دن منانا ہوتا تو ایک مخصوص مکتب فکر کے افراد کے بجائے پوری امت آنجنابؓ کی شہادت کے دن سوگ مناتی۔ اگر سوگ کے دن منانے کا سلسلہ جاری رہے تو بتائیے کون کون سے دن سوگ منایا جاتے گا۔ یاں کا کون سا دن ہوگا جو کسی نہ کسی عظیم شخصیت اور اولیاء اللہ کی شہادت یا وفات کا دن نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دین میں سوگ اور ماتم اور ان کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جس گھر میں کسی کی وفات ہو تو سوگ کی کیفیت کی زیادہ سے زیادہ تین دن کے لئے اجازت ہے۔ اس میں بھی فوج گریہ اور سینہ کوبی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ باقی رہا یہ کہ ان میں سے

جنہوں نے بھی اللہ کی راہ میں قربانیاں دی ہیں اور حق و صداقت کے لئے اپنی جانیں دی ہیں، اس کی بنیاد پر ان کا بہت ارفع و اعلیٰ مقام ہے۔ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ہ لیکن نہ دن اور یادگار منانا ہمارے دین کے مطابق ہے اور نہ یہ کوئی رنج و غم اور الم و حزن کا معاملہ ہے اور نہ ہر سال سوگ اور ماتم کرنا دین سے کوئی مناسبت رکھتا ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے یہاں صوفیاء کے نزدیک موت کو ایک محبوب اور محب کی ملاقات کا وقت تصور کیا جاتا ہے، یہ جو لفظ رُعرس، رائج ہے تو اس کے معنی شادی کے ہیں۔ جیسے رُعرس (شادی) ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے ویسے ہی موت کسی مرد مومن کے لئے کسی رنج و غم کا موقع ہے ہی نہیں، بلکہ وہ طبعی ہو چکا ہے قتل کی صورت میں ہو۔ یہ تو درحقیقت ایک محبوب اور محب کی ملاقات ہے اس پہلو سے علامہ اقبال کا وہ شعر ذہن میں رکھتے کہ

نشانِ مرد مومن یا تو گویم چو مرگ آید تبسم برباوست

تو تبسم خوشی کے موقع پر ہوتا ہے نہ کہ غمی کے موقع پر، پس یہ سوگ اور ماتم کے دن منانا قطعاً ہمارے دین کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے معاشرے میں یہ غلط رواج چلا آ رہا ہے کہ محرم الحرام، بالخصوص اس کے پہلے عشرے میں شادیاں نہیں ہوتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذی الحجہ کے آخری عشرے میں شادیوں کا ایک طوفان آ جاتا ہے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ امسال ذی الحجہ کے آخری دنوں میں لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں شادیاں انجام پائی ہیں۔ آخر ہم نئے محرم الحرام بالخصوص اس کے پہلے عشرے کو شادی بیاہ کی تقریب کے لئے حرام یا منہوس کیوں سمجھ لیا ہے!!



سائنس و کربلا



ڈاکٹر اسرار احمد

کے آیت تفسیر

جو موصوف نے محرم الحرام ۱۴۰۲ھ

کو قبل از نماز جمعہ

جامع مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور

میں ارشاد فرمائی

سائیکہ کربلا

مُحَمَّدًا وَنُصَلِّيَ عَلَيَّ رَسُوْلِي الْكَرِيْمِ
 فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ
 اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ وَلَا تَقُولُوا الْمَنُ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 أَمْوَاتٌ طَبْلًا حَيَاءً وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ وَلَنْ يَبْلُوكُمْ
 بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ
 وَالشَّمَرَاتِ وَلَبِئْسَ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ
 مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ
 عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ فَذُكِّرْكَ هُمُ
 الْمُهْتَدُونَ هـ (البقرة ۱۵۳ تا ۱۵۷) صَدَقَ اللَّهُ الْعَظِيمُ

ان آیات کی تلاوت اور ادنیٰ مسنونہ کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا:
 حضرات! دو دن بعد محرم الحرام ۱۴۰۲ھ کی دس تاریخ ہوگی جو یوم
 عاشوراء کہلانا ہے۔ یقیناً یہ بارت آپ کے علم میں ہوگی کہ اہل محرم الحرام سن
 ۶۱ ہجری کو ایک نہایت افسوسناک حادثہ دشتِ کربلا میں پیش آیا تھا جس میں
 سبطِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سیدنا حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما

اور آپ کے خانوادے کے اکثر افراد نیز آپ کے اعوان و انصار کی کثیر تعداد نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس حادثہ کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جانی چاہیے کہ یہ اچانک ظہور پذیر ہونے والا حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ درحقیقت اسی سبائی سازش کا ایک مظہر تھا جو پورے پچیس سال قبل اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک حادثے کو جنم دے چکی تھی یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے داماد اور تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۶ھ کو پیش آیا تھا اور ۱۶ اکتوبر (۱۷ ذی الحجہ) کے جمعہ کے اجتماع میں، میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت اور ان کی شہادت کے تاریخی پس منظر پر کچھ گفتگو کی تھی۔ جس پر زیادہ دن نہیں گزرے لہذا مجھے آج سہولت محسوس ہو رہی ہے کہ واقعہ کو بلا کے بیان کے ضمن میں، میں اپنی گفتگو کا تسلسل اسی کے ساتھ جوڑ سکتا ہوں۔

اولاً ذہن میں یہ بات تازہ کر لیجئے کہ حق و باطل کی جو کشمکش ازل سے چلی آرہی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اس کے ضمن میں ہمیں تاریخ کا کچھ ایسا نقشہ نظر آتا ہے کہ زیادہ تر غلبہ باطل کا رہا۔ حق کے غلبے کے ادوار بڑے مختصر رہے یہ بھی ایک حقیقت کبریٰ ہے کہ جب کبھی حق کا غلبہ ہوا ہے تو باطل نے اسے اپنی آخری شکست تسلیم نہیں کیا بلکہ ایسے مواقع پر وہ وقتی طور پر دبک جاتا رہا ہے۔ اس نے منافقانہ طور پر حق کا لبادہ اوڑھ لیا ہے یا وہ وقتی طور پر زیر زمین چلا گیا ہے۔ چنانچہ وہ اندر ہی اندر اپنی ریشہ وینوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے اور ایسے مواقع کی تاک میں رہتا ہے۔ جب وہ حامیان حق کے درمیان کوئی شدید اختلاف و انتشار پیدا کر کے اپنے لئے راستہ بنا سکے۔ اور حق کے خلاف کھڑا ہو سکے۔

چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کا عظیم ترین معجزہ دنیا کو

اس خاص موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کا پرتاثر خطاب ”شہید مظلوم“ کے

نام سے مطبوعہ موجود ہے (مرتب)

دکھا دیا۔ یعنی جَاءَ الْحَوِثُ وَنَزَّ هَقًّا لِبَاطِلِ مِطِّ كَانَتْشَه بِالْفِعْلِ قَانِدًا نَسَائِتِ
 کو چشم سر سے دیکھنے کا موقع فراہم فرما دیا۔ اور ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر حق کو
 بالفعل قائم و نافذ فرما کر رشتہ دنیا تک کے لئے ایک کامل نمونہ پیش فرما دیا۔ حق غالب
 اور باطل سرنگوں ہو گیا۔ لیکن باطل نے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام
 کے آخری مرحلے میں وہی روش اختیار کی کہ وقتی طور پر شکست تسلیم کر کے وہ
 اس انتظار میں رہا کہ موقع آئے تو میں وار کروں اور کاری وار کروں۔ چنانچہ
 اُن حضور کے انتقال کے فوراً بعد فتنوں کا ہجوم اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی کاذب مدعیانِ
 نبوت میدان میں آگئے اور ان کے ساتھ کافی جمعیت ہو گئی۔ پھر مانعین و منکرین
 زکوٰۃ سے سابقہ پیش آیا اور اہل ایمان کو بیک وقت ایسے ایسے عظیم فتنوں سے
 نبرد آزما ہونا پڑا کہ وقتی طور پر تو محسوس ہوتا تھا کہ حق کا چرغ اب بجھا کہ بجھا
 یہ درحقیقت وہ انقلابِ دشمن قوتیں COUNTER REVOLUTIONARY

FORCES — تھیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے واقعتاً صدیق ہی نہیں
 بلکہ صدیقِ اکبر کی شخصیت درکار تھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ صدیق دراصل نبی کا
 عکسِ کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق نے ثابت کر دیا کہ جس انقلاب کی
 تکمیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس فرمائی تھی اس کے خلاف آپ
 کی وفات کے بعد جو ردِ عمل ظاہر ہوا، اس کی سرکوبی کرنے کی پوری صلاحیت
 اور عزمیت اور آہنی قوتِ ارادی ان کے نجیب و نزار جسم میں موجود تھی۔ حضرت
 ابو بکر نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کو مستحکم CONSOLIDATE
 کیا اور زمامِ کار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے کر کے وہ بھی اپنے مالکِ حقیقی کی
 طرف مراجعت فرما گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اور جیسا کہ میں حضرت
 عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت والی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت
 ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بارہ سالہ دورِ خلافت میں سے بھی کم و بیش دس سال بالکل دو
 فاروقی ہی کی شان کے حامل تھے لہذا ان کو بھی شامل کر لیجئے تو یہ بیس سالِ اسلام
 کے استحکام اور اس کی توسیع کے سال ہیں۔ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ

دالسلام کے زیر نگیں عراق و شام و فارس و ایران، کے پورے پورے ملک اور شمالی افریقہ کا مصر سے مراکش تک کا وسیع علاقہ آگیا اور اس پر اسلام کا جھنڈا ابرائے لگا اور اللہ کا دین غالب و نافذ ہو گیا۔۔۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس کے خلاف بھی ایک رد عمل ہونا تھا۔ یہ جو *HISTORICAL PROCESS* ہے اس کے کچھ غیر متبدل اصول ہیں۔ آپ کے علم میں ہے کہ جس انقلاب کی تکمیل اندرون عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبض نبض فرمائی۔ اس کے رد عمل میں محاکمانہ تحریکیں *RE-ACTIONARY MOVEMENTS* اٹھ کھڑی ہوئیں تو توسیع کا جو مرحلہ آپ کے بال تاروں کے ہاتھوں انجام پایا، اس کا رد عمل کیوں نہ ہوتا۔ چنانچہ باطل نے پہلا وار کیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات پر۔ باطل پرست یہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ پوری عمارت اسی ایک ستون پر کھڑی ہے اس کو گرا دو عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ الحمد للہ کہ ان کی توقع غلط ثابت ہوئی اور عمارت برقرار رہی۔ یہ سازش نالغس ایرانی سازش تھی۔ ابولوفیروز پارسی ایرانی غلام اور اس کی پشت پر ہرمزان ایک ایرانی جرنیل تھا۔ اس سازش کی ناکامی کے بعد جو دوسرا وار ہوا وہ بہت کاری دار تھا۔ اس میں یہود کی عیاری اور کیاوی شامل تھی۔ ان کا سازشی ذہن اور اس میں مہارت ضرب المثل بن چکی ہے۔ عبداللہ بن سبا یمین کا ایک یہودی اٹھتا ہے۔ اسلام کا لبادہ اوڑھتا ہے۔ مدینہ منورہ میں آکر قیام کرتا ہے اور نئے نئے شکوے چھوڑنے شروع کرتا ہے۔ کہیں محبت آل رسول کے پردے میں حضرت عثمان کی خلافت کے متعلق دوسرے انداز می کرتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاق خلافت کا پروپیگنڈہ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر نبی کا ایک وسی ہوتا ہے اور وہی خلافت کا حق دار ہوتا ہے تو اصل میں حضور کے وسی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں لہذا خلافت کے حقدار وہ ہیں ان کی بجائے جو بھی مسند خلافت پر فائز ہوا یا اب ہے، وہ غاصب ہے۔ کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے عقیدے کا پرچار کرتا ہے۔ جس سے اسلام کی جڑ توحید، پرکاری ضرب لگتی ہے۔ ایرانی نو مسلم جن کی گھٹی میں نسلا بعد نسل شاہ پرستی اور *Hero war* *ship* بڑی ہوئی تھی اور جو نسب کی بنیاد پر اقتدار کی منتقلی کے خوگر تھے، ان کے

پر اس کا کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا۔ کہیں بظاہر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت
 بیان کرنے کے لئے یہ نظر یہ پیش کرتا ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول
 ثانی ہوگا تو ہمارے رسول جو افضل الانبیاء ہیں، وہ بھی دوبارہ واپس تشریف
 لائیں گے۔ اب دیکھئے کہ غیر عرب نو مسلم خوش عقیدہ لوگوں کے دلوں کو یہ بات
 کتنی بھانے والی ہے کہ اس طرح آں حضور کی عظمت کا بیان ہو رہا ہے یہی
 حربہ ہے جو اس دور میں قادیانیوں نے استعمال کیا۔ حضرت مسیح کے آسمان
 پر اٹھائے جانے اور ان کے نزول کے عقیدے کی نفی کرنے کے لئے انہوں
 نے اسی دلیل کا رخ اس طرف رکھا کہ اس طرح تو ہمارے رسول کی عظمت مجروح
 ہوگی یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے نبی تو فوت ہو گئے ہوں اور حضرت مسیح آسمان پر
 زندہ موجود ہوں اور دوبارہ تشریف لائیں۔ گویا اصل بات یہی ہے کہ عوام الناس
 کی اکثریت عقیدت کی بنیاد پر اس قسم کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ان
 باتوں نے سادہ لوح لوگوں کے ذہن اور دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ یہ شخص مدینہ
 سے بصرہ گیا، وہاں اس نے اپنا ایک مرکز قائم کیا۔ پھر کوفہ گیا، وہاں اس نے اپنا ایک
 مرکز قائم کیا۔ دمشق جا کر وہاں کوشش کی لیکن وہاں وال نہیں گلی۔ پھر مصر گیا وہاں اپنے
 ہم خیالوں کی ایک جماعت پیدا کی اور ہر طرف اس نے ایک فتنہ و فساد کی فضا پیدا کر دی
 اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری دو سال اس
 فتنہ و فساد کی نذر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین مظلومانہ شہادت
 ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس وقت عظیم ترین مملکت کے فرماں روا
 تھے، لاکھوں کی تعداد میں فوجیں موجود تھیں جو ان کے اشارے پر کٹ مرنے
 کے لئے تیار تھیں۔ جب مٹھی بھر باغیوں نے اس شہید مظلوم کا محاصرہ کر
 رکھا تھا تو مختلف صوبوں کے گورنروں کی طرف سے استدعا آرہی تھی کہ ہم کو
 اجازت دیجئے کہ ہم فوجیں لے کر حاضر ہو جائیں اور ان باغیوں کی سرکوبی کریں۔
 لیکن وہ امام وقت رضی اللہ عنہم کئے ہوئے تھے کہ میں اپنی جان کی حفاظت و مدافعت
 میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اتنی عظیم قوت و سطوت

کا حامل اور اس طرح اپنی جان دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے اور اپنی جان کی حفاظت و مدافعت میں کسی کا خون بہانے کیلئے تیار نہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ پوری تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ بات بھی جان لیجئے کہ ہمارے ہاں شاعری میں بے پناہ مشرکانہ ادہام موجود ہیں۔ غلط فکر اور عقیدوں کی ترویج میں شاعری نے بہت حصہ لیا ہے۔ ایسے اشعار زبان زد عوام و خواص ہو جاتے ہیں، جن میں غلو بھی ہوتا ہے اور غلط فکر بھی۔ شعراء کے متعلق قرآن حکیم نے یہ دو ٹوک بات فرمادی ہے کہ :- وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ هَذَا تَرَاثُمُهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهْتُمُونَ ه” اور شعراء کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پیچھے تو بہکے ہوتے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں۔“ محتاط ترین لوگ بھی جب شاعری کی ترنگ میں آتے ہیں تو ان کی زبان و قلم سے بھی غیر محتاط اور غلط باتیں نکل جاتی ہیں۔ مثلاً آپ علامہ اقبال کے اس شعر پر غور کیجئے :-

غریب و سادہ رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمعیل

غور طلب بات یہ ہے کہ شہادتِ حسین اور ذبحِ اسمعیل میں کون سی چیز مشترک ہے۔ حضرت اسمعیل کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ کون ہوتے؟ اللہ کے ایک حبیبِ القدر پیغمبر!۔ کیا حضرت حسین کی شہادت بھی کسی ایسے ہی ایک حبیبِ القدر شخص کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ کونسی قدر مشترک ہے؟ حضرت اسمعیل نے تو ذبح ہونے کیلئے خود ہی اپنی گردن پیش کی تھی بھولتے آیت قرآنی: فَلَمَّا اسْلَمَا۔ پس جب ان دونوں باپ بیٹوں نے سر تسلیم خم کر دیا، باپ اور بیٹے دونوں نے فرماں برداری کا بے مثال اور تاریخی ساز منظر ہرہ پیش کیا لہذا اس آیت میں تثنیہ کا صیغہ اسلما آیا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اور وہ ”فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ“ (سورہ توبہ) ”تو وہ قتل کرتے بھی ہیں اور کبھی قتل ہو بھی جاتے ہیں“ کے مصداقِ کامل بنے تھے تو وہ کونسی بات ہے جو ان دونوں واقعات

کے مابین کسی پہلو سے مشترک قدر قرار دی جاسکتی ہے! پھر وہاں تو ارادہ ذبح تھا۔ لیکن ذبح بالفعل ہوا نہیں۔ یہاں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالفعل شہید کئے گئے ہیں لہذا ان واقعات میں آپ کو کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی۔ ہاں ایک واقعاتی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم بقید حیات ہوتے تو ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو تبدیل کر کے یوں کر دیا جائے تو واقعاتی اقدار کا اشتراک پیدا ہو جائے گا کہ:-

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
ہنایت اس کی ہیں عثمانؓ ابتدا ہا بیلؓ

حضرت ہابیل کا قتل ہوا ہے اور اس شان کے ساتھ ہوا ہے کہ بھائی قتل پر تلا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ لَسِنُ بَسَطْتُكَ إِلَى يَدِكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِأَسِطٍ يَدِي إِلَيْكَ لَا قَتْلَكَ ج (آیت ۲۸) انہوں نے اپنے بھائی قابیل سے کہا ”اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تب بھی میں اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ تم کو قتل کرنے کے لئے۔“ اور ہابیل قتل ہو گئے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کا کلام اللہ میں سورہ المائدہ میں بڑے اہتمام اور بڑی شان کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس پر ہمیں وہ آیت مبارکہ ملتی ہے کہ ”اسی لئے ہم نے یہ لکھ دیا ہے کہ جس شخص نے بھی کسی ایک انسانی جان کو ناحق اور بغیر سبب قتل کیا تو اس نے گویا پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جس نے ایک بھی جان بچائی، اس نے گویا پوری نوع انسانی کی جان بچائی۔ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (آیت ۳۲) یہ واقعہ حضرت ہابیل کا ہے۔ اس کی کامل مناسبت اور مشابہت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت میں ہے۔ ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے۔ طاقت ہے، قوت ہے، سب کچھ ہے حضرت طلحہ، حضرت زبیر ابن العوام۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم محضرین کی سرکوبی کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ انصار آ رہے ہیں کہ ہمیں

اجازت دیجئے، ہم دوسری مرتبہ اللہ کے انصار بننا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم نے جناب
 محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جاں نثاری میں اللہ کے مددگار ہونے کا خطاب
 حاصل کیا ہے آج ہم خلیفۃ الرسول کی مدد کرنے کی خواستگار ہیں۔ ہمیں موقع دیجئے کہ
 ہمارے اس خطاب کی پھر تجدید ہو جائے۔ مختلف صوبوں کے گورنروں کے جو بیانات
 آ رہے تھے کہ ہمیں فوجیں لے کر آنے کی اجازت دیجئے اس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔
 حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو صبر و ثبات کے کوہ ہمالیہ ثابت ہوئے، جو اب
 یہی تھا کہ نہیں، میں اپنی مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون بہانے کی اجازت نہیں دوں
 گا۔ دروازے پر پہرہ دار تھے۔ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن
 زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ لیکن پیچھے سے باغی دیوار مچاند کر گئے اور اس مستی
 کو شہید کر دیا جس کو ذوالنورین کا لقب حاصل تھا۔ اور جس سے نبی اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم راضی تھے اور جس کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ ”اے اللہ“ میں
 عثمانؓ سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی رہیو۔“ حضرت عبداللہ بن سلام
 جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک جید یہودی عالم تھے، وہ آتے ہیں اور باغیوں
 کو مخاطب کرتے ہیں کہ لوگو! باز آ جاؤ۔ میں تورات کا عالم ہوں اور میں تمہیں بتاتا
 ہوں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اللہ کے کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم سے
 کم ستر ہزار انسان قتل نہ ہوتے ہوں یا کبھی کسی نبی کے خلیفہ کو قتل کیا گیا ہو، اور
 اس کے بعد کم از کم پتیس ہزار انسانوں کو قتل نہ کیا گیا ہو۔،۔۔ جان لیجئے کہ حضرت
 عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے کی آگ بھڑکی، اس میں چوراسی ہزار مسلمان قتل
 ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت کے پورے پورے پانچ برس
 باہم خانہ جنگی میں گزرے۔ جنگِ جمل ہے اور جنگِ صفین ہے۔ جنگِ نہروان ہے۔
 مسلمان کے ہاتھ میں مسلمان کا گریبان ہے اور مسلمان کی تلوار مسلمان ہی کا خون
 چاٹ رہی ہے۔ مسلمان کا نیزہ ہے جو مسلمان کے سینے کے پار ہو رہا ہے اور کیسے
 کیسے لوگ! حضرت طلحہؓ شہید ہو رہے ہیں، حضرت زبیرؓ شہید ہو رہے ہیں حضرت
 عمارؓ بن یاسر شہید ہو رہے ہیں۔ پھر یہ کہ حضرت علیؓ شہید ہو رہے ہیں۔ حضرت امیر
 معاویہؓ پر حملہ ہوا لیکن ان پر وار کاری نہ پڑا اور وہ بچ گئے۔ حضرت عمر ابن العاصؓ

پر حملہ ہوا، لیکن وہ اُس روز کسی وجہ سے نماز فجر کے لئے آئے نہ تھے، اس لئے ان کے مغالطے میں ان کے قائم مقام شہید ہوئے۔ پھر نہ جانے ان کے علاوہ کیسے کیسے مخلص اور شجاع مسلمان ان جنگوں میں کھیت لے رہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ اس سارے فتنے کی آگ بھڑکانے والے عبداللہ بن سبا کے حواری تھے اور یہ وہ آگ تھی جو پھر ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اس سبائی سازش کو سمجھنے کے لئے میں جنگ جمل کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں جو تمام مستند تاریخوں میں موجود ہے۔ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب فوج کے ساتھ نکلی ہیں اور بصرہ پر ان کا قبضہ ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مدعی نہیں تھیں، معاذ اللہ۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ خون عثمانؓ کا قصاص لیا جائے۔ اس وقت دونوں لشکر آمنے سامنے تھے اور حضرت عائشہ اور حضرت علیؓ جنگ کے بجائے گفت و شنید سے قضیہ منٹانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ خون عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ لیکن پہلے ان کے ہاتھ تو مضبوط کئے جائیں۔ اگر ان کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے اور انہیں تقویت پہنچائی جائے تو وہ فتنہ پردازوں سے پورا پورا حساب لیں گے۔ لہذا بات چیت شروع ہوئی۔ ایک بڑھی امید افزا فضا نظر آنے لگی کہ حالات درست ہو جائیں گے۔ لیکن عین اُس وقت عبداللہ بن سبا اور مالک بن اشتر نخعی رات کی تاریکی میں سازش کرتے ہیں کہ اس طرح تو ہمارا بھانڈا پھوٹے گا۔ ہماری سازش کا پردہ چاک ہوگا۔ یہ جو ڈرامہ کھیلنے کے لئے ہم نے ایسٹج بچھائی ہے، یہ تو برباد ہو جائے گی۔ لہذا وہ رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں کو لے کر حضرت عائشہؓ کے کیمپ پر حملہ کرتے ہیں۔ ادھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے۔ ادھر وہ حضرت علیؓ کے کیمپ میں یہ پیغام بھیجتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے لشکر نے حملہ کی ابتدا کی ہے اور وہ اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ چنانچہ دونوں لشکر ایک دوسرے سے پوری طرح بھڑکے۔ آپ اس بات کو پیش نظر رکھئے کہ جب جنگ چھڑ

جاتی ہے تو تحقیق کا وقت کوئی نہیں ہوتا اور یہ قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ عین اس وقت تفتیش ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ کس نے ابتدا کی تھی اور اس کا اصل محرک کیا ہے؟ یہ تو وہ وقت ہوتا ہے کہ لوگ اپنی جان ہتھیوں پر رکھے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ پھر جو خون ریزی ہوئی ہے اور سو ڈوسو نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ایک دوسرے کی تلوار سے شہید ہوئے ہیں یہ ہماری تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔ اس سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ واقعہ فتنے کی آگ کو بھڑکانے والا چھوٹا سا گروہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو اس کو اس طرح بھڑکاوے کہ پھر اُسے بھجایا نہ جاسکے۔ یہی معاملہ جنگِ صفین کے موقع پر ہوا ہے۔ وہاں بھی مصالحہ گفتگو کی فضا پیدا ہو گئی تھی، لیکن سبائی سازشی گروہ نے اُسے بھی ناکام بنا دیا اور فتنہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس میں 'خوارج' کے گروہ کا اضافہ ہو گیا اور ایک نیا محاذ کھل گیا۔

آگے چلیے۔ وقت کی قلت کی وجہ سے مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے اختصار کے ساتھ کرنا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک خارجی کے ہاتھوں شہادت ہوتی ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ حضرت علیؑ کے عہدِ خلافت میں عالم اسلام ایک وحدت کی صورت میں باقی نہیں رہا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شام کے گورنر کی حیثیت سے اس بات کے مدعی تھے کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لیا جانا چاہیے۔ یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ حضرت معاویہؓ نے قطعاً خلافت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ وہ نہ ہرگز مدعی خلافت تھے۔ نہ حضرت علیؓ کی خلافت کے منکر۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ حضرت علیؓ خلافت کے حق دار نہیں ہیں۔ معاذ اللہ۔ اور یہ کہ ان کے بدلے مجھے خلافت ملنی چاہیے ہرگز نہیں۔ وہ صرف خونِ عثمانؓ کے قصاص کے مدعی تھے۔ ان کی ایک وسیع رفتی پر بحیثیت گورنر حکومت رہی ہے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ قاتلانِ عثمانؓ کو جو حضرت علیؓ کے کیمپ میں شامل اور معاملات میں پیش پیش تھے سزا دی جائے۔ اس کے بعد وہ بیعت کر لیں گے۔ ان کا موقف صحیح تھا یا غلط۔ اس پر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں ہے۔ فی الوقت پیش نظر صرف اس سورتِ واقعہ کا بیان ہے۔

کہ اُس وقت عالمِ اسلام ایک وحدت کی حیثیت سے موجود نہیں تھا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد کوفہ میں حضرت حسن رضی

اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت ہوئی۔ اب معلوم ہوا کہ نئے سرے سے

تصادم کی نوبت آنے والی ہے۔ ادھر حضرت حسن کوفہ سے چالیس ہزار فوج لیکر

چلتے ہیں۔ ادھر حضرت معاویہ دمشق سے ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوتے

ہیں۔ مدائن کے آس پاس دونوں لشکروں کی ٹڈ بھیر ہوتی ہے۔ حضرت حسن

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کا ہراول دستہ آگے آگے جا رہا تھا۔ اس کے متعلق یہ

افواہ اڑ گئی کہ اس کو شکست ہو گئی۔ یہ افواہ کس نے اڑائی۔ واللہ اعلم۔ نتیجہ

یہ نکلا کہ وہی کوفی جو حضرت حسن کے ساتھ تھے، انہوں نے وہاں وہ طوفان

بدتمیزی برپا کیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ بغاوت کر دی، خیمے لوٹ لئے جناب

حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر دست درازمی کی آں جناب کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔

ان باغی کوفیوں کے ہاتھوں اپنی جان کا خطرہ دیکھ کر آنجناب کو کسریٰ کے محل

میں پناہ لینی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان

کوفیوں کے مزاج کا بخوبی تجربہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے مصالحِ دین کی خاطر وہیں سے

حضرت معاویہ کو مصالحت کی پیش کش ارسال کر دی جسے حضرت معاویہ نے

نے فوراً قبول کر لیا اور اپنی طرف سے ایک سادہ سفید کاغذ پر اپنی مہر لگا کر حضرت

حسن کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ جو شرطیں آپ چاہیں لکھ دیں،

مجھے منظور ہوں گی۔ جس کو ہم BLANK CHEQUE سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

چنانچہ مصالحت ہو گئی۔ مصالحت نامہ میں ایک شرط یہ تھی کہ ایران کے صوبے

اہواز کا خراج حضرت حسن کو ملے گا۔ یہ ایران کا وہی صوبہ ہے جس کا آج کل اخبارات

میں ایران و عراق کی جنگ کے سلسلے میں کافی ذکر ہو رہا ہے۔ اور جہاں عرب

کافی تعداد میں آباد ہیں۔ ایک دوسری شرط یہ تھی کہ بیس لاکھ درہم سالانہ

میرے چھوٹے بھائی حسین کو ملیں گے۔ ایک اور شرط یہ بھی تھی کہ وظائف

کی تقسیم کے معاملے میں بنی ہاشم کے حق کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تسلیم

کیا جائے گا۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس پر کسی سے

باز پرس نہیں ہو کی گویا یہ عام معافی (GENERAL AMNESTY) کا اعلان تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام شرائط منظور کر لیں اور الحمد للہ تقریباً پانچ سال کے اختلاف، افتراق، انتشار اور باہمی خانہ جنگی کا دروازہ بند ہوا۔ اب پورا عالم اسلام ایک وحدت بن گیا، واضح ہے کہ اس کے بعد حضرت معاویہ نے بیعت خلافت لی ہے۔ اس صلح کے واقعہ پر حضرت حسن نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا کہ "اگر خلافت ان کا یعنی حضرت معاویہ کا حق تھی تو ان تک پہنچ گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں نے بھی ان کو سونپ دی۔ جھگڑا ختم ہوا۔ یہ وہ بات تھی جس کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ میرے اس بیٹے یعنی حضرت حسن کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک وقت میں مسلمانوں کے دو گروہوں میں مصالحت کرائے گا۔ یہ خصوصی مقام اور رتبہ ہے۔ جناب حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔" "یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!"۔ لیکن ذہن میں رکھئے۔ وہ سازشی سبائی اس صورت حال سے سخت مشتعل تھے۔ انہوں نے حضرت حسن پر طعن کیا۔ آپ کی طرح طرح سے توہین کی آپ کو "یا عار المؤمنین" یعنی "اے اہل ایمان کے حق میں عار اور ننگ اور شرم کے باعث انسان" اور "یا مذلل المؤمنین" یعنی "اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے انسان" کہا گیا۔ یہ توہین آمیز خطابات وہ لوگ آپ کو دیتے تھے جو بظاہر آپ کے حامی تھے وہ بر ملا کہتے تھے کہ اے حسن تم نے یہ صلح کر کے ہماری ناک کٹوا دی ہے اور "اہل ایمان" کے لئے تم نے کوئی عزت کا مقام باقی نہیں رکھا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس اُمت کی طرف سے ابوالاباد تک حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جزا و خیر عطا فرمائے کہ ان کے اس ایشار کی بدولت وہ رخنہ بند ہو گیا اور وہ دراڑ پُر ہو گئی جو عالم اسلام میں اس آپس کے خلفشار کی وجہ سے پڑ گئی تھی۔ اب اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ پورے بیس برس تک عالم اسلام پھر متحد رہا۔ یہ بات میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد حکومت کو اہلسنت دور خلافت راشدہ میں شامل نہیں کرتے۔ اسلامی حکومت کا آئیڈیل مزاج وہ ہے جو ہمیں حضرت ابو بکر سے لے کر حضرت عثمان کے ابتدائی دس سال تک نظر

آتا ہے۔ حضرت معاویہؓ صحابی اور کاتب وحی ہیں۔ کسی بدعتی کو ہم انؓ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور صحیح ہے کہ انؓ کا وہ مقام اور مرتبہ کبھی کسی نے نہیں سمجھا جو حضرت علیؓ کا ہے رضی اللہ عنہ۔ میں نے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے اور اس کا آج پھر اعادہ کرتا ہوں کہ حضرت علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جو جھگڑے ہوئے اور مسلمانوں میں آپس میں جو جنگیں ہوئیں، حاشا وکلا ان کا کوئی الزام حضرت علیؓ کی ذات پر نہیں ہے۔ اس میں انؓ کا نہ کوئی قصور تھا نہ کوتاہی۔ معاذ اللہ۔ یہ تو اغیار کی سازش تھی کہ انہوں نے فتنہ کی آگ کو اس طرح بھڑکا یا بھٹکا کہ اُس کو بجھایا نہ جاسکا۔ لیکن حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت کے یہ بیسٹ سال امن کے سال ہیں۔ باہمی خانہ جنگی ختم ہو گئی۔ عہد ہوتا ہے جاوہ پیمانہ پھر کارواں ہمارا، کی کیفیت پیدا ہوئی اور دعوت و تبلیغ اور جہاد و قتال کے عمل کا احیاء ہوا۔ تو وسیع از سر نو شروع ہوئی۔ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ یہ بیسٹ سالہ دورِ خلافت راشدہ کے بعد اُمت کی تاریخ میں جتنے بھی ادوار آئے ہیں، ان میں سب سے افضل اور بہتر دور ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ سربراہ حکومت ایک صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بعد معاملہ آتا ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا لیکن وہ صحابی نہیں ہیں۔ تابعی ہیں۔ ”عہدِ گریہ“ کا لقب نہ کنی زندیقی!“ ہم کسی غیر صحابی کو صحابی کے ہم پلہ اور ہم مرتبہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی بھی اُمت کے بڑے سے بڑے ولی سے افضل ہے۔

چنانچہ یہی بات ایک دوسرے انداز میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہی تھی۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا امیر معاویہؓ، انہوں نے جواب دیا کہ ”معاویہؓ سے عمر بن عبدالعزیزؓ کے افضل ہونے کا سوال کیا پیدا ہوگا۔ عمر بن عبدالعزیزؓ سے تو وہ خاک بھی افضل ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کے نتھنوں میں گئی ہے۔“ یہ فرق ہے صحابیت اور غیر صحابیت

میں۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت کے بیس سال میں امن رہا۔ واضح رہے کہ حضرت حسینؓ بھی وہیں ہیں، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی دس سال تک زندہ رہے۔ سن ۱۰ھ میں یہ صلح ہوئی تھی اور سن ۱۵ھ میں حضرت حسنؓ کا انتقال ہوا ہے۔ ان کا انتقال زہر کے اثر سے ہوا، زہر کس نے دیا، کیوں دیا؟ اس کا تعلق حضرت معاویہؓ سے ہونا بعید از قیاس ہے۔ ان کو کیوں ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ حضرت حسنؓ کو زہر دلو اتے۔ جبکہ صلح کے بعد ان دونوں کے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے۔ زہر دینے والا کوئی سمجھ میں آسکتا ہے تو وہ دُہی گروہ ہو سکتا ہے کہ جس نے آل جنابؓ کو ”عار المؤمنین“ اور ”مذمل المؤمنین“ جیسے اہانت آمیز خطابات دیئے تھے اور آپؓ کو طرح طرح سے ذہنی اذیتیں پہنچانی تھیں ظاہر ہے کہ زہر دلا یا ہوگا تو اسی گروہ نے دیا یا ہوگا۔ جن سے ان کی مصالحت ہے ان کی طرف سے زہر دلانے کا امکان بہر حال عقل انسانی تسلیم نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد آتا ہے امیر بیزید کی بحیثیت دلی عہد نامہ زدگی اور پھر ان کے دورِ حکومت میں سانحہ کربلا کا واقعہ جو دردناک بھی ہے اور افسوس ناک بھی اور جس نے بلاشک و شبہ تاریخ اسلام پر بہت ہی ناخوشگوار اثرات چھوڑے ہیں۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ سے عرض کروں کہ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ اگرچہ اُمت میں اختلاف اور افتراق کے افسانے بہت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے باقی اختلافات فقہی اختلافات ہیں عقائد کے اختلافات نہیں ہیں۔ عقائد کے اختلافات تو ہمارے ہاں کے کچھ نچلی سطح کے نام نہاد و اعظیمن اور مولویوں نے بنائے ہیں کہ جن کی دوکان چلتی ہی ان اختلافات کے بل پر ہے۔ درنہ ذہن میں رکھیے کہ دیوبندی ہوں، بریلوی ہوں ان کے عقائد ایک ہیں، عقائد کی مستند کتب ان کے ہاں ایک ہیں۔ ان کی فقہ بھی ایک ہے۔ پھر اہل سنت کے جو دوسرے گروہ ہیں، وہ مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں، اہلحدیث ہوں، ان میں فقہی معاملات میں اختلافات ہیں، عقائد ایک ہی ہیں۔ ہاں عقائد میں جو اختلاف اور فرق واقع ہوا ہے تو وہ شیعوں اور سنیوں کے مابین ہوا ہے۔

اس اختلاف کو واقعہً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخی واقعات کے بارے میں رائے اور سیاسی اختلافات کو ایک طرف رکھا جاسکتا ہے۔ شخصیات کے بارے میں بھی اگر اختلاف ہو تو اسے بھی کسی حد تک نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ کسی کا ذاتی رجحان اگر یہ ہو کہ وہ حضرت علیؑ کو حضرت ابو بکرؓ سے افضل سمجھتا ہو۔ تو یہ بھی ایسی بنیادی و اساسی بات نہیں ہے کہ جسکی بنا پر من و یکریم تو دیگری کا معاملہ ہو سکے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پوری اُمت محمد علیؑ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو افضل ترین شخصیت ہی نہیں سمجھتی بلکہ پوری نوع انسانی میں انبیاء کرام کے بعد افضل البشر سمجھتی ہے لیکن اسے بھی عقیدے کا بنیادی اختلاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ یہ لکھتے ہیں کہ ”اگر میری طبیعت کو اس کی آزادی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ حضرت علیؑ کی فضیلت کی قائل ہوتی نظر آتی ہے۔ لیکن مجھے حکم ہوا ہے کہ میں حضرت ابو بکر صدیق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی فضیلت کا اقرار کروں“ میری ناقص رائے میں خلفائے راشدین کی فضیلت میں تقدیم و تاخیر اگرچہ فی نفسہ ایک اہم مسئلہ ہے تاہم اسے عقیدے کا اختلاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اصل اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک معصومیت ختم ہو چکی ہے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ ہمارے نزدیک آل حضور خاتم النبیین والمرسلین کے ساتھ ساتھ خاتم المعصومین بھی ہیں اور ہم اسے ایمان بالنبوت اور ایمان بالرسالت کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں اور یہ بات یقیناً بنیادی عقیدے سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ ختم نبوت کا لازمی نتیجہ ہے چونکہ عصمت و معصومیت خاصہ نبوت ہے، نبوت ختم ہوئی تو عصمت و معصومیت بھی ختم ہوئی۔ اب نبوت کے بعد اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ وحی نبوت کا دروازہ بند ہے اور تا قیام قیامت بند ہے گا۔ تاریخ انسانی کا بقیہ سارا دور اجتہاد کا ہے۔ اجتہاد میں مجتہد اپنی امکانی حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس کی رائے قرآن و سنت ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ لیکن وہ معصوم عن الخطاء نہیں ہے۔ اس اجتہاد میں خطاء بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر نیک نیتی کے ساتھ خطا ہے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مجتہد مخطی کو بھی اجر و ثواب ملیگا۔ اگرچہ اکبرا۔ اور مجتہد اگر مصیب ہو یعنی صحیح رائے تک پہنچ گیا ہو تو اسے دو برابر اجر

ملے گا۔ جبکہ شیعہ مکتب فکر کا عقیدہ امامتِ معصومہ کا ہے۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ
 میں نے ابھی عرض کیا معصومیت خاصہ نبوت ہے۔ وہ اپنے آئمہ کو بھی معصوم مانتے
 ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان سے خطا کا صدور ممکن نہیں۔ ہمارے اعتبار
 سے تو اس نوع کی امامت ایک قسم کی نبوت بن جاتی ہے۔ اور ہر قسم کی نبوت
 کو ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم سمجھتے ہیں۔ لہذا نبوت کے بعد جو بھی زمانہ آیا اس
 میں کسی کا جو بھی اقدام ہے اس میں ہم احتمالِ خطا کو بعید از امکان نہیں سمجھتے۔
 خواہ وہ اقدام حضرت علیؑ کا ہو خواہ حضرت ابو بکرؓ یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کا۔
 لہذا اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے کسی فیصلہ یا اقدام کے بارے میں یہ رائے
 دینا چاہے کہ فلاں معاملے میں ان سے خطا ہوئی تو اسے حق ہے، وہ کہہ سکتا ہے
 البتہ دلیل سے بات کرے اور اسے اجتہادی خطا سمجھے تو یہ بات ہمارے عقیدے
 سے نہیں ٹکرائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پوری چودہ سو سال کی تاریخ میں
 حضرت ابو بکرؓ کے دور سے لے کر آج تک کسی شخص نے صدیقِ اکبرؓ کی کسی خطا
 کو پکڑا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ امکانِ خطا موجود تھا۔ اور
 وہ معصوم عن الخطا نہیں تھے، لہذا کوئی شخص اگر یہ کہنا چاہے کہ ان سے خطا ہوئی،
 یہ نہ کرتے یا یوں کرتے تو بہتر تھا تو ہم اس کی زبان نہیں پکڑیں گے۔ چونکہ ہم ان کی
 معصومیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ کو تو خود اپنی بعض اجتہادی آراء میں
 خطا کا احساس ہوا، جن سے انہوں نے علی الاعلان رجوع کر لیا۔ البتہ اپنی ایک
 خطا کا وہ صرف اعتراف کر سکے، اس کا ازالہ نہ ہو سکا۔ وہ یہ کہ حضرت ابو بکرؓ کے
 عہدِ خلافت میں خود انہوں نے حضرت ابو بکرؓ پر زور دے کر وظائف کے تعین کے
 معاملے میں ایک فرق رکھوایا۔ یعنی یہ کہ بدری صحابہ کو دوسروں کے مقابلے میں
 کافی زیادہ وظیفہ ملنا چاہیے، اور اصحابِ شجرہ کو بدری صحابہ سے کم لیکن دوسروں
 سے زیادہ وظیفہ ملنا چاہیے۔ یہ فرق مراتبِ حضرت عمرؓ نے رکھوایا۔ اور اپنی حیات
 دنیوی کے آخری ایام میں آپ اس پر پھینکتے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ وہ بھی جان
 لیجئے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مسلمانوں کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت
 کی وجہ سے نہایت عظیم الشان فتوحات ہوتی چلی گئیں اور مالِ غنیمت بے حد حصار،

دارالاسلام میں آنے لگا۔ اب جو بڑے بڑے وظائف باقاعدگی سے ملے تو اس نے سر یہ داری کی شکل اختیار کر لی۔ اس لئے کہ معاشرے میں بالفعل یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی کہ صدقہ خیرات لینے والا کوئی مستحق ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ بنا بریں از نکاز دولت کی شکل پیدا ہوتی شروع ہو گئی اور وظائف میں فرق و تفاوت نے اصحاب دولت و ثروت کے مابین بھی عظیم فرق و تفاوت پیدا کر دیا۔ اگر وہ دولت کسی مہوار و مساوی طریقے پر منتقل ہوتی تو یہ صورت حال رونما نہ ہوتی۔ یہ وہ چیز تھی جس کو دیکھ کر حضرت عمر فاروق نے کہا تھا کہ ”لو استقبلت ما استدربت لآخذت فضول اموال الاغنیاء و لقسمتہ بین الناس“ او کما قال، ”اب اگر کہیں وہ صورت حال دوبارہ پیدا ہو جائے جو اب پیچھے جا چکی ہے تو میں لوگوں کے اموال میں جو فاصلہ ہے وہ لیکر دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔“ پس معلوم ہوا کہ آنجنابؓ کو ایک احساس ہوا۔ یہ بات میں نے صرف اس لئے عرض کی ہے کہ اہل سنت کا یہ موقف واضح ہو جائے کہ خطا کا احتمال و امکان ہر صحابی کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اس خطا کو اجتہادی خطا قرار دیں گے، اُسے نیک نیتی پر محمول کریں گے۔ یہ بات ہر صحابی کے بارے میں کہی جائے گی۔ یہی بات اور یہی رائے نہ صرف حضرت امیر معاویہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ بلکہ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی۔ یہاں تک کہ حضرات شیخینؓ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

لہذا یہ بات پیش نظر رکھتے کہ اب گفتگو کا جو مرحلہ آ رہا ہے جو حضرت امیر معاویہؓ کے ایک اہم اقدام سے متعلق ہے۔ اس کے بارے میں بھی دو رائے ممکن ہیں۔ ان کو یہ بات حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے سوجھانی رجوعاً طور پر ایک نہایت ذہین و فہم مدبر اور دُور رس نگاہ رکھنے والے صحابی مانے جاتے ہیں کہ ”دیکھتے مسلمانوں میں آپس میں جو کشت و خون ہوا اور پانچ برس کا جو عرصہ آپس کی لڑائی جھگڑے میں گزرا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے بعد پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں

لہذا اپنی جائنشین کا مسئلہ اپنی زندگی ہی میں طے کر کے جاتیے۔ اب کوئی شخص چاہے اور ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، تو وہ بڑی آسانی سے حضرت میغرہ بن شعبہؓ پر یہ فتویٰ لگا دے کہ انہوں نے کسی لالچ اور کسی انعام کی امید کی وجہ سے یا چالپوسی کے خیال سے یہ رائے دی۔ معاذ اللہ ہم یہ رائے نہیں دے سکتے۔ حضرت میغرہ بن شعبہؓ ان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہیں جنہوں نے حدیبیہ میں نبی اکرمؐ کے دست مبارک پر وہ بیعت کی تھی جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے، چنانچہ اس بیعت پر سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ نے انہیں رضوان کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ اصحاب شجرہ میں سے ہیں۔ پھر حضرت علیؓ کے پورے عہد حکومت میں وہ حضرت علیؓ کے بڑے حامیوں (SUPPORTERS) میں سے تھے اور ہر مرحلے میں انہوں نے حضرت علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ دیا لیکن وہ امت کے حالات کو دیکھ رہے تھے۔ آپس کی خانہ جنگی کا انہیں تلخ اور دردناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ جو انگریزی کی مثل ہے کہ ”بہت سا پانی دریا میں بہ گیا ہے“ اس کے مصداق حالات میں بہت کچھ تبدیلی آچکی ہے یہ سلسلہ ہجری کے لگ بھگ کا زمانہ ہے۔ آل حضورؐ کی وفات پر پورے پچاس برس گزر چکے ہیں۔ کبار صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظیم اکثریت اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ اب تو صغار صحابہؓ میں بھی کچھ ہی لوگ موجود ہیں اور یہ گویا صحابہ کی دوسری نسل کے افراد ہیں۔ جیسے حضرت زبیر بن العوامؓ شہید ہو چکے، اب ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیرؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ شہید ہو چکے اب ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ ہیں حضرت عباسؓ اللہ کو پیارے ہو چکے البتہ ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ ہیں، الغرض چند صغار صحابہؓ کو چھوڑ کر تقریباً تانہ نوے فی صد لوگ تو بعد کے ہیں۔ پھر وہ جوش و جذبہ ایمانی بھی پچاس سال کے بعد اس درجے کا نہ رہا تھا جو خلافت راشدہ کے ابتدائی پچیس سال تک نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ”جوہر اندیشہ“ اور شدت احتیاس کا عالم تو یہ ہے کہ خود حضرت ابوبکرؓ نے ایک موقع پر جب کچھ عیسانی آئے اور ان کو قرآن مجید کی آیات

سنائی گئیں اور شدت تاثر سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "ہلکذا کنا حتی قست القلوب" یعنی "یہی حال کبھی ہمارا ہوا کرتا تھا کہ قرآن مجید پڑھتے تھے اور سنتے تھے تو ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دل سخت ہو گئے" ذرا غور فرمائیے یہ بات حضرت ابو بکرؓ اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ ہمارے دل سخت ہو گئے۔ اسی طرح انتقال کے وقت حضرت عمرؓ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ "میں اگر برابر برابر پر چھوٹ جاؤں تو بہت بڑی کامیابی سمجھوں گا" پھر یہی حضرت عمر فاروقؓ ہیں جو حضرت خذیفہؓ سے پوچھتے تھے کہ "میں قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں۔ کہیں میرا نام ان منافقوں کی فہرست میں تو نہیں تھا جن کے نام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بتائے تھے" تو ان جلیل القدر صحابہ کے شدتِ احساس کی یہ صورت تھی تو آپ سوچئے کہ "تابہ ویکراں چہ رسدا" لہذا ان حالات میں حضرت مغیرہؓ کی سمجھ میں مصالحِ امت کا یہی تقاضا آیا کہ امیر معاویہؓ اپنا کوئی جانشین نامزد فرمادیں۔ چونکہ اس وقت فی الواقع بحیثیت مجموعی امت کے حالات اس جمہوری اور شورائی مزاج (REPUBLICAN CHARACTER) کے متحمل نہیں رہے ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا فرمایا تھا۔ لہذا حالات کے پیش نظر ایک سیڑھی نیچے اتر کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت مغیرہؓ نے دلائل کے ساتھ حضرت معاویہؓ سے اصرار کیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کریں اور اس کی بیعت ولیعہدی لیں۔ پھر ان ہی نے جانشینی کے لئے جناب یزید کا نام تجویز کیا۔ یہاں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ جو شخص بھی کسی درجے میں حضرت مغیرہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بد نیت قرار دے گا۔ اس کا معاملہ اہل سنت سے جدا ہو جائے گا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ "الصحابۃ کلہم عدول"۔ بد نیتی کی نسبت ہم ان کی طرف نہیں کر سکتے، اختلاف کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں معصوم نہیں مانتے۔ ان سے خطا ہو سکتی ہے۔ ان کے کسی فیصلہ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ صحیح فیصلہ نہیں تھا۔ کوئی یہ کہے تو اس سے اس کے ایمان، عقیدہ اور اہل سنت میں سے ہونے پر

کوئی حرف نہیں آئے گا۔ یہ رائے دی جاسکتی ہے لیکن جو شخص بد نیتی کو کسی صحابی رسول کی طرف منسوب کرتا ہے جان لیجئے کہ وہ خواہ اور کچھ بھی ہو بہر حال اہل سنت والجماعت میں شمار نہیں ہوگا۔ اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے یعنی یہ کہ جن کی نیک نیتی ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ عمل اسلام کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھنے والا نہیں ہے۔ ان میں پانچ نام بہت مشہور ہیں۔ تین تو امت کے مشہور و عبادہ، میں سے ہیں یعنی حضرت عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ایک حضرت حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ایک حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ انہوں نے یزید کی بیعتِ ولی عہدی سے انکار کیا۔ اور ذہن میں رکھئے کہ یہ تاریخی جملہ حضرت عبدالرحمن ابن ابی بکرؓ کا ہے کہ جب مدینہ کے گورنر نے ولی عہدی کی بیعت لینے چاہی ہے تو انہوں نے بڑے غصے سے کہا کہ ”کیا اب تم رسول اللہؐ اور خلفاء راشدین کی سنت کے بجائے قیصر و کسریٰ کی سنت رائج کرنا چاہتے ہو کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہو“ تیسری جانب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ان پانچ حضرات کو چھوڑ کر امت کی عظیم ترین اکثریت نے بیعت کر لی۔ جس میں کثیر تعداد میں صحابہؓ بھی شامل تھے۔ اب اس واقعہ کے بعد اگر کوئی چاہے تو ان سب کو بے ضمیر قرار دے کسی کی زبان کو تو نہیں پکڑا جاسکتا۔ کہنے والے یہ بھی کہہ دیں گے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے ان کے ایمان دولت کے ذریعے خرید لئے تھے۔ لیکن ذرا توقف کر کے غور فرمائیے کہ ”نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں“ کے مصداق سب سے پہلے اس زو میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی آئے گی۔ گویا انہوں نے حضرت معاویہؓ کے حق میں دولت کے عوض دستبرداری قبول کر کے اپنی خلافتِ فروخت کی تھی۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ لیکن ایسی بات کہنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ اس طرح ہدفِ ملامت و اہانت کون کون سی لائقِ صدا جہترام ہستیاں بنتی ہیں۔ ہم ان سب کو ٹیک نیت سمجھتے ہیں۔ جو بھی صحابہ کرامؓ اس وقت موجود تھے ان میں سے جنہوں نے ولی عہدی کی بیعت

کی اور جنہوں نے انکار کیا وہ سب کے سب نیک نیت تھے۔ سب کے پیش نظر اُمت کی مصلحت تھی۔ حضرت حسنؑ نے جو ایشیا فرمایا تھا وہ تو قیام قیامت اُمت پر ایک احسان عظیم شمار ہوگا۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھئے کہ جو دوسرا مکتب فکر ہے وہ حضرت حسنؑ کو بھی امام معصوم مانتا ہے لہذا ان کا طرز عمل خود ان کے اپنے عقیدے کے مطابق صدی صدی درست قرار پاتا ہے۔

اب آئیے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اہل سنت اس معاملے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ پوری نیک نیتی سے آنجنابؑ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے شورائی اور جمہوری مزاج کو بدلا جا رہا ہے۔ حالات کے بُرخ کو اگر ہم نے تبدیل نہ کیا تو وہ خالص اسلام جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور وہ کامل نظام جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا، اس میں کجی کی بنیاد پڑ جائے گی، لہذا اسے ہر قیمت پر روکنا ضروری ہے۔ یہ رائے ان کی تھی اور پوری نیک نیتی سے تھی۔ پھر شہر کوفہ کے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے برابر ان کو پیغامات بھیج رہے تھے اور کوفیوں کے خطوط سے حضرت حسینؑ کے پاس بوریاں بھر گئی تھیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ کوفہ صرف ایک شہر نہیں تھا بلکہ اس کی سیاسی اور فوجی حیثیت سے بڑی اہمیت تھی۔ لہذا آنجنابؑ کی رائے تھی کہ اہالیان کوفہ کے تعاون سے وہ حالات کا رُخ صحیح جانب موڑ سکتے ہیں۔ عین کر چکا ہوں کہ ایسے تمام معاملات اجتہاد ہی ہوتے ہیں۔ اس رائے میں حضرت عبداللہ ابن عباسؑ بھی شریک تھے کہ ولی عہدی کی جو رسم پڑ گئی ہے وہ اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لیکن وہ آگے یا کراختلاف کرتے ہیں۔ ان کا اختلاف تھا کامیابی کے امکانات کے بارے میں وہ کوفہ والوں کو قطعی ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی اقدام سے پہلے خوب اچھی طرح جائزہ لینا ہوتا ہے کہ اقدام کے لئے جو وسائل و ذرائع ضروری ہیں وہ موجود ہیں یا نہیں۔ نبی اکرمؐ اور اہل ایمان پر قتال مکے میں فرض نہیں ہوا تھا بلکہ مدینہ میں ہوا جبکہ اتنی قوت بہم پہنچ گئی تھی کہ قتال سے اچھے نتائج کی توقع کی جاسکے، حضرت عبداللہ ابن عباسؑ کی مخلصانہ رائے تھی کہ کامیاب اختتام کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ فی الوقت

موجود نہیں ہیں۔ لہذا وہ حضرت حسینؑ کو کوفہ والوں کی دعوت قبول کرتے اور وہاں جانے سے باسرا ردالمحاح منع کرتے رہے۔ لیکن حضرت حسینؑ کی رائے یہ تھی کہ کوفہ والوں کی دعوت قبول کرنی چاہیے اصل معاملہ یہ تھا کہ جو سچا انسان ہوتا ہے وہ اپنی سادگی اور شرافت میں دوسروں کو بھی سچا ہی سمجھتا ہے۔ اور اپنی صداقت کی بنیاد پر دوسروں سے بھی حسن ظن رکھتا ہے۔ کوفہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا۔ انتہائی STRATEGIC مقام پر کوفہ واقع تھا۔ یہ سب سے بڑی چھاؤنی تھی جو حضرت عمر فاروق کے دور میں قائم کی گئی تھی۔ اس لئے کہ یہ وہ مقام ہے جس سے اس شاہراہ کا کنٹرول ہوتا ہے جو ایران اور شام کی طرف جاتی ہے لہذا حضرت حسینؑ یہ رائے رکھتے تھے کہ اگر کوفہ کی عظیم اکثریت ان کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جس کے ذریعے اسلامی نظام میں جو تبدیلی لائی جا رہی ہے اس کا ازالہ کیا جاسکتا ہے اور اس کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ لیکن اس رائے سے اختلاف کر رہے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ ابن زبیر بھی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ یہ اختلاف بھی معاذ اللہ بدلتی پر پنی نہیں تھا۔ وہ بھی یعنی حضرت حسینؑ بھی اور یہ یعنی تینوں عبادلہ بھی نیک نیت تھے۔ ان تینوں حضرات نے لاکھ سمجھا یا کہ آپ کوفہ والوں پر ہرگز اعتماد نہ کیجئے۔ یہ لوگ قطعی بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ یہ لوگ جو کچھ آپ کے والد بزرگوار کے ساتھ کرتے رہے ہیں، اس کو یاد کیجئے۔ جو کچھ آپ کے برادرِ محترم کے ساتھ کر چکے ہیں اس کو پیش نظر رکھیئے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان کے دل آپ کے ساتھ ہوں لیکن ان کی تلواریں آپ کی حمایت میں نہیں اٹھیں گی بلکہ معمولی خوف یاد باؤ یا لالچ سے آپ کے خلاف اٹھ جائیں گی۔ لیکن حضرت حسینؑ کا ایک فیصد تب جس پردہ کمال استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس معاملہ میں فرمانِ خداوندی اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کر رہے ہیں یعنی "وَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ" یعنی پہلے خوب غور کر لو، سوچ لو، امکانات کا جائزہ لے لو۔ تدبیر کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ ساز و سامان کی فراہمی

ضروری ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ جو سورتِ حال (SITUATION) فی الواقع درپیش ہے اس کے تقاضے پورے کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ لیکن جب ان مراحل سے گزر کر ایک فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اقدام کرو۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ؛ یہ رہنمائی ہے قرآن و سنت میں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت حسینؑ نے ASSESSMENT میں غلطی کی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کسی بد نیتی سے یا حکومت و اقتدار کی طلب میں یہ کام کیا۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بات سے کھلم کھلا اور سرعام اعلانِ برأت کرتا ہوں۔ اگر کسی کو یہ شک و شبہ یا غلط فہمی ہو کہ معاذ اللہ میری یہ رائے ہے کہ حضرت حسینؑ کے اس اقدام میں کوئی نفسانیت یا کوئی ذاتی غرض تھی تو میں اس سے بالکل بری ہوں الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ کسی کی یہ رائے اگر ہو تو ہو لیکن اچھی طرح جان لیجئے کہ اہل سنت کے جو مجموعی اور مجمع علیہ عقائد ہیں ان میں یہ بات شامل ہے کہ حضرت حسینؑ کے اقدام اور مشاہرات صحابہؓ کے ضمن میں کسی صحابیؓ رسولؐ پر بد نیتی اور نفسانیت کا حکم لگانے سے ایمان میں خلل واقع ہوگا۔ بلا تخصیص ہم تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو عدول مانتے ہیں۔ البتہ معصوم کسی کو نہیں مانتے اور ہر ایک کے خطا و اجتہاد ہی کے احتمال و امکان کو تسلیم کرتے ہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیک نیتی سے ایک رائے تھی۔ نیک نیتی ہی سے ایک اندازہ (ASSESSMENT) تھا اور جب اس پر انشراح ہو گیا تو دین ہی کے لئے عزیمت تھی جب ولی عہدی کی بیعت کا مسئلہ مدینہ منورہ میں پیش ہوا تھا تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ وہاں سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے۔ حضرت حسینؑ نے بھی ایسا ہی کیا۔ چند حضرات کی رائے یہ تھی کہ مکہ مکرمہ ہی کو STRONG HOLD اور اصل BASE بنایا جائے اور اس ولی عہد کے خلاف رائے عامہ کو ہوا رکرنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا جائے۔ ابھی اس سلسلہ میں کوئی مؤثر کام شروع نہیں ہو سکا تھا کہ حضرت امیر معاویہؓ کا انتقال ہو گیا اور بحیثیت ولی عہد حکومت امیر زبیرؓ کے ہاتھ میں آگئی۔ جس کے بعد کوفہ

والوں نے خطوط بھیج بھیج کر حضرت حسینؑ کو اپنی وفاداری اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جدوجہد اور اقدام کا یقین دلایا۔ اُس جناب نے تحقیق حال کیلئے اپنے چچا زاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؓ کو کوفہ بھیجا۔ ان کی طرف سے بھی اطلاعات یہی موصول ہوئیں کہ اہل کوفہ بدل و جان ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ حضرت حسینؑ نے کوفہ کے سفر کا ارادہ کر لیا اور کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں نے بہت سمجھایا کہ مکہ سے نہ نکلئے۔ یہ دونوں حضرات یہ کہتے ہوتے رو پڑے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح امیر المومنین حضرت عثمانؓ کو ان کے گھر والوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا۔ اسی طرح آپ کے اہل و عیال کے سامنے آپ کو بھی ذبح کر دیا جائے۔ جب حضرت حسینؑ نے کوچ کیا ہے تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کی سواری کے ساتھ ڈورتے ہوئے دو تک گئے ہیں اور اصرار کرتے رہے ہیں کہ خدا کے لئے باز آجائیے اور اگر جانا ہی ہے تو خواتین اور بچوں کو تو ساتھ لے کر نہ جاتیے۔ اور یہ عبداللہ بن عباسؓ کون ہیں! رشتے میں ایک جانب سے حضرت حسینؑ کے چچا لگتے ہیں۔ تو دوسری طرف نانا۔ اس لئے کہ والد یعنی حضرت علیؑ کے بھی چچا زاد بھائی ہیں اور نانا یعنی نبی اکرمؐ کے بھی چچا زاد بھائی ہیں! لیکن اس وقت محبت سے مغلوب ہو کر کہہ رہے ہیں 'اے ابن عم! خدا کے لئے باز آ جاؤ یا کم از کم ان عورتوں اور بچوں کو مکہ مکرمہ ہی میں چھوڑ جاؤ۔ لیکن نہیں، دوسری جانب عزیمت کا ایک کوہ گراں ہے۔ پیکر شجاعت ہے۔ سراپا استقامت ہے۔ نیک نیتی سے جو فیصلہ کیا ہے اس پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد راستے میں جب اطلاع ملی کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ جو ایلچی اور تحقیق کنندہ کی حیثیت سے کوفہ گئے تھے۔ وہاں شہید کر دیئے گئے اور کوفہ والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رہی۔ سب کے سب گورنر کوفہ کے سامنے حکومتِ وقت کے ساتھ وفاداری کا عہد استوار کر لیا ہے تو حضرت حسینؑ نے سوچا شروع کیا کہ سفر جاری رکھا جائے یا مکہ واپسی ہو۔ لیکن ذہن میں رکھیے کہ ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے جو انسان کی شخصیت کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ عرب کا مزاج یہ تھا کہ خون کا بدلہ لیا جائے

خواہ اس میں خود اپنی جان سے بھی کیوں نہ ہاتھ دھو لینے پڑیں۔ چنانچہ حضرت مسلم کے عزیز رشتہ دار کھڑے ہو گئے کہ اب ہم ان کے خون کا بدلہ لئے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ حضرت حسین کی شرافت اور مروّت کا تقاضا تھا کہ وہ ان لوگوں کا ساتھ نہ چھوڑیں جو ان کے مشن میں ان کا ساتھ دینے کے لئے نکلے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مسلم بن عقیل کے خونِ ناحق کا بدلہ لینے کے عزم کا اظہار کر لے والوں کا ساتھ یہ پیکرِ شرافت و مروّت نہ دیتا۔ لہذا سفر جاری رہا۔ اسی دن حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ جو چچا زاد بھائی ہیں، ان کے بیٹے حضرت عون اور حضرت محمدان کا پیغام لے کر آئے ہیں ”کہ خدا کے لئے ادھر مت جاؤ“ لیکن فیصلہ اٹل ہے۔ ان دونوں کو بھی ساتھ لیتے ہیں اور سفر جاری رہتا ہے حتیٰ کہ قافلہ دشتِ کربلا میں پہنچ گیا۔ ادھر کوفہ سے گورنر ابن زیاد کا لشکر آ گیا یہ لشکر ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اس کو صرف ایک حکم تھا کہ وہ حضرت حسین کے سامنے یہ دو صورتیں پیش کرے کہ آپؑ نہ کوفہ کی طرف جاسکتے ہیں نہ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں۔ ان دونوں سمتوں کے علاوہ جدھر آپ جانا چاہیں اس کی اجازت ہے۔ یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ تیسرا راستہ کون سا ہو سکتا تھا! وہ راستہ تھا دمشق کا۔ لیکن افسوس کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے اختیار نہ کیا بلکہ آپؑ وہیں ڈٹے رہے۔ اب عمرو بن سعد کی قیادت میں مزید چار ہزار کا لشکر کوفہ پہنچ گیا۔ اور یہ عمرو بن سعد کون تھے؟ افسوس کہ ان کے نام کو گالی بنا دیا گیا ہے۔ یہ تھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتحِ ایران اور یکے از عشرہ مبشرہ کے بیٹے۔ جنکی حضرت حسین کے ساتھ قرابت داری بھی ہے وہ بھی مصالحت کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور گفت و شنید جاری رہتی ہے۔ اب حضرت حسین کی طرف سے تین سو تین پیش ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ”یا مجھے مکہ مکرمہ واپس جانے دو۔ یا مجھے اسلامی سرحدوں کی طرف جانے دو تا کہ میں کفار کے خلاف جہاد و قتال میں اپنی زندگی گزاروں۔ یا میرا راستہ چھوڑ دو۔ میں دمشق چلا جاؤں۔ میں مزید سے اپنا معاملہ خود طے کر لوں گا۔“ لیکن اب گھبراتنگ ہو گیا ہے۔ اور صورتِ حال کجیر

بدل گئی ہے۔ اور یہ بھی خوب جان لیجئے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ حضرت حسینؑ نے میدانِ کربلا میں ابن زیاد کے بھیسے ہوئے لشکروں کے سامنے جو خطبات دیئے۔ اس میں انہوں نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ میرے پاس کوفیوں کے خطوط موجود ہیں جنہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے اس کوفی فوج کے بہت سے سرداروں کے نام لے لیکر فرمایا: اے نلاں ابن نلاں! یہ تمہارے خط ہیں کہ نہیں؟ جن میں تم نے مجھ سے بیعت کرنے کے لئے مجھے کوفہ آنے کی دعوت دی تھی، جس پر وہ لوگ براءت کرنے لگے کہ نہیں ہم نے یہ خطوط نہیں بھیجے۔ اب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی چونکہ مصالحت کی صورت میں حکومت وقت سے ان کی غداری کا جرم ثابت ہو جاتا۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے واقعات یاد کیجئے۔ جہاں بھی مصالحت کی بات ہوگی، وہاں وہی سبائی فتنہ اٹے آئے گا جو اس سارے انتشار و افتراق اور خانہ جنگیوں کا بانی رہا ہے۔ مصالحت کی صورت میں تو ان کا کچا چٹھا کھل جاتا اور معلوم ہو جاتا کہ دوستی کے پردوں میں رہ کر کون دشمنی کرتا رہا ہے اور وہ کون ہیں جو سادہ لوح عوام کو دھوکا دے کر اور خواص کو بہلا پھسلا کر مسلمان کو مسلمان کے خلاف محاذ آرا کرتے آ رہے ہیں۔ حضرت حسینؑ کے پاس کوفیوں کے بوریاں بھرے خطوط تھے مفاہمت کی صورت میں جب یہ سامنے آتے تو ان کا حشر کیا ہوتا۔ اس کو اچھی طرح آج بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سرداروں اور ان کے حواریوں نے مصالحت و مفاہمت کا سلسلہ جاری رہنے نہیں دیا اور عمرو بن سعد کو مجبور کر دیا کہ وہ حضرت حسینؑ کے سامنے یہ شرط پیش کرے کہ یا تو غیر مشروط طور پر SURRENDER کیجئے۔ ورنہ جنگ کیجئے۔ یہ سازشی لوگ حضرت حسینؑ کے مزاج سے اتنے ضرور واقف تھے کہ ان کی غیرت و حمیت غیر مشروط طور پر حوالگی کے لئے تیار نہیں ہوگی اور فی الواقع ہوا بھی یہی۔ یہاں یہ جان لیجئے کہ معاملہ تھا حضرت حسینؑ ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ان کی غیرت، ان کی حمیت ان کی شجاعت اس توہین و تذلیل کو ہرگز گوارا نہ کر سکتی تھی۔ لہذا انہوں نے غیر مشروط SURRENDER کرنے سے انکار کر دیا اور مسلح تصادم ہو کر رہا۔ جس کے

نتیجے میں سانحہ کربلا واقع ہوا۔ دادِ شجاعت دیتے ہوئے آپ کے ساتھی شہید ہوئے۔ آپ کے اعزہ واقارب نے اپنی جانیں نچھاور کیں اور آپ نے بھی تلوار چلاتے ہوئے اور دشمنوں کو قتل کرتے ہوئے جاہم شہادت نوش فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ۔ یہ ہے اصل حقیقت اس سانحہ فاجعہ کی۔ اصل سازشی ذہن کو پہچانئے۔ جیسے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان اختلاف کا افسانہ جس نے بھی تراشہا ہے بڑی عیارانہ مہارت سے تراشا اور گھڑا ہے۔ اس افسانے سے حقائق گم کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اصل مجرم کو Pin Point کیا جائے۔ کوئی حضرت عثمان کو تنقید کا ہدف بناتا ہے تو کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ اس طرح یہ دونوں فریق ان سازشی سبائیوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عثمان کی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کا کام بنتا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی مجروح ہوتی ہے تو بھی ان کے پورا ہوتے ہیں۔ یہ عثمان کون ہیں؟ یہ ہیں ذوالنورین، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد اور یکے از عشرہ مبشرہ۔ اور یہ علی کون ہیں؟ آلِ حضور کے تربیت یافتہ آپ کے چچا زاد بھائی۔ آپ کے داماد۔ آپ محبوب اور یکے از عشرہ مبشرہ۔ ان دونوں میں سے کسی کی بھی شخصیت مجروح ہوتی ہے تو اس کی زد پڑتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر۔ جو ان دونوں کے مزکی و مرتبی تھے۔ ان شخصیتوں میں اگر نقص اور عیب مانا جائے گا تو محمد رسول اللہ کی تربیت پر حرف آئے گا اور ان حضرت کی شخصیت مبارکہ مجروح ہوگی۔ افسوس کہ آج بھی ان سبائیوں کا کام دونوں طرف سے بن رہا ہے۔ خوب جان لیجئے کہ ایسے تمام لوگ چاہے وہ اس کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، سبائی ایجنٹ ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ”الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عِدُوْلٌ“ کوئی بدعتی اور نفسانیت نہ حضرت عثمان میں تھی نہ حضرت علی میں، نہ حضرت معاویہ میں تھی نہ حضرت مغیرہ بن شعبہ میں نہ حضرت عمرو بن العاص میں تھی نہ حضرت ابو موسیٰ اشعری میں نہ حضرت حسین ابن علی میں تھی نہ حضرت عبداللہ ابن عباس

یا عبداللہ ابن عمر میں رسواں اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ہاں ایک فتنہ تھا جس نے ہر مرحلہ پر جب بھی مصالحت و مفاہمت کی صورت پیدا ہوتی نظر آئی، اس کو تار پٹو کیا اور اس کے بجائے ایسی نازک صورت حال CRITICAL SITUATION پیدا کر دی کہ کشت و خون ہو۔ مسلمان ایک دوسرے کی گردنوں پر تلواریں چلائیں اور فتنہ اور بھڑکے اور حق کے سیلاب کے آگے بند باندھا جاسکے۔ اور عرصہ ”رکتانہ تھا کسی سے سیل رواں بہارا“ والی صورت ختم ہو سکے۔ چنانچہ کون انصاف پسند ایسا ہوگا جو نہ جانتا ہو کہ حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت سے لے کر کربلا کے سانحہ فاجعہ تک مسلمانوں کی آپس میں جو مسلح آویزش رہی ہے اس میں درپردہ ان سبائیوں ہی کا ہاتھ تھا۔ مستند تواریخ اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ البتہ ان کو نگاہ حقیقت بین اور انصاف پسندی کے ساتھ پڑھنا ہوگا۔ جنگِ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتح ہوئی۔ آنجناب نے حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ بالکل وہی جو ایک بیٹے کو ماں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ چالیس خواتین اور حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لشکر کے معتبر ترین لوگوں کے ہمراہ پورے ادب و احترام کے ساتھ ان کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ نہ ذاتی دشمنی تھی نہ بغض و عناد۔ اور ادھر کیا ہوا! معاذ اللہ، تم معاذ اللہ کیا امیر یزید نے خاندان رسالت کی خواتین کو اپنی لونڈیاں بنایا؟ آخر وہ دمشق بھی گئی تھیں، لیکن وہاں کیا ہوا! ان کا پورا احترام کیا گیا، ان کی دلجوئی کی گئی، ان کی خاطر مدارت کی گئی۔ امیر یزید نے انتہائی تأسف کا اظہار کیا اور کہا کہ ”ابن زیاد اس حد تک نہ بھی جاتا تو بھی میں اس سے راضی رہ سکتا تھا۔ کاش وہ حسینؑ کو میرے پاس آنے دیتا ہم خود ہی باہم کوئی فیصلہ کر لیتے۔ لیکن کربلا میں جو کچھ ہوا وہ اس فتنے کی وجہ سے ہوا جو کوفیوں نے بھڑکایا تھا۔ جو اپنی دو عملی اور منافقت کی پردہ پوشی کے لئے نہیں چاہتے تھے کہ مصالحت و مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو۔ ان کو جب محسوس ہوا کہ بہائی سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا تو انہوں نے وہ صورت حال پیدا کر دی جو ایک نہایت دردناک اور الم انگیز

انجیام پر منتج ہوئی۔

یہ سانحہ فاجعہ انتہائی افسوس ناک تھا۔ اس سے کون اختلاف کر سکتا ہے! اس نے تاریخ پر جو گہرے اثر ڈالے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں اس کے کڑوے اور کسیلے پھل کا مزہ امت چودہ سو سال سے چکھتی چلی آرہی ہے۔ ان دو واقعات یعنی شہادت حضرت عثمان اور شہادت حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی وجہ سے ہمارے درمیان افتراق، انتشار اور اختلاف اور باہمی دست و گریباں ہونے کی جو فضا چلی آرہی ہے، اس پر ان لوگوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلتے ہیں جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی۔ جہاں جہاں اس کے اثرات پہنچے، وہ حقیقت کامیابی ہوئی ہے۔ ان کو جو دراصل ان فتنوں کی آگ کو بھڑکانے والے تھے۔ اب کوئی بیزید کے نام کو گالی بنائے پھرتا ہے۔ کسی نے شمر کے نام کو گالی بنایا ہوا ہے۔

کوئی عمرو بن سعد کے نام کو گالی بنائے ہوتے ہے۔ یہاں تک بات پہنچی ہے کہ لوگ حضرت امیر معاویہؓ کے شان میں بھی توہین آمیز اور گستاخانہ انداز اختیار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے سب لوگوں کو ہدایت دے اور ہمیں ان میں شامل ہونے سے بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کو ہمیشہ مد نظر رکھنے کی توفیق عطا فرمائے کہ :-

”اللَّهُ اللَّهُ فِي أَحْصَابِي لَا تَتَّخِذُوا هُمُ
عَرَضًا مِّنْ بَعْدِي فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبُحِبِّ
أَحَبَّهُمْ وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبْغَضِي أَبْغَضَهُمْ“

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

کر بلا کی کہانی

حضرت ابو جعفر محمد باقرؑ کی زبانی

ترجمہ

از مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجپانی
(ماخوذ از ہفت روزہ 'الاسلام' لاہور)

روایت کے راوی عمار دہنی نے کہا کہ میں نے محمد بن علی بن الحسین سے عرض کیا کہ آپ مجھ سے واقعہ قتل حسینؑ ایسے انداز سے بیان فرمائیں کہ گویا میں خود وہاں موجود تھا اور یہ سامنے ہو رہا ہے اس پر حضرت محمد باقرؑ نے فرمایا: امیر معاویہ کے انتقال کے وقت ولید بن عتبہ بن ابی سفیان حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا بھتیجا یزید کا چچرا بھائی مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ ولید نے حسب دستور حضرت حسینؑ کو پیغام بھیجا تاکہ ان سے نئے امیر یزید کے لئے بیعت لیں۔ حضرت حسینؑ نے جواب میں فرمایا کہ سر دست آپ سوچنے کی مہلت دیں اور اس بارے میں نرمی اختیار کریں۔ ولید نے ان کو مہلت دے دی۔ حضرت حسینؑ مہلت پا کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

دریں اثناء جب کوفہ والوں کو اس کا پتہ چلا کہ حضرتؑ تو مکہ تشریف پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے اپنے قاصد حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں روانہ کئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کوفہ تشریف لے آئیں، ہم اب آپ ہی کے ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ یزید کی بیعت سے منحرف ہیں۔ ہم نے گورنر کوفہ کے پیچھے جمع ہو کر ٹھہرا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت نعمان بن بشیر انصاریؓ یزید کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے۔ جب اہل کوفہ کی طرف سے اس قسم کی درخواستیں آئیں۔ تو حضرت

حسینؑ نے اپنے چہرے بھائی مُسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجنے کا پروگرام بنایا تاکہ وہ کوفہ جائیں اور وہاں جا کر صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لیں۔ اگر اہل کوفہ کے بیانات صحیح ہوتے تو خود بھی کوفہ پہنچ جائیں گے۔

حضرت مسلم کی کوفہ روانگی

قرار داد کے مطابق حضرت مسلم مکہ شریف سے مدینہ منورہ پہنچے وہاں سے راستہ کی راہنمائی کے لئے دو آدمی ساتھ لئے اور کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس راستہ سے وہ لے گئے اس میں ایک ایسا لوق و دق میدان آگیا جس میں پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے سخت دوچار ہو گئے۔ چنانچہ اسی جگہ ایک رہنما انتقال کر گیا۔ اس صورتِ حال کے پیش آنے پر حضرت مسلم نے حضرت حسینؑ کو ایک خط لکھ کر کوفہ جانے سے معذرت چاہی لیکن حضرت محمدؐ و روح نے معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لکھا کہ آپ ضرور کوفہ جائیں۔ بنا بریں حضرت مسلم کوفہ کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچ کر ایک شخص عوسجہ نامی کے گھر قیام فرمایا۔ جب اہل کوفہ میں حضرت مسلم کی تشریف آوری کا چرچا ہوا تو وہ خفیہ طور پر ان کے ہاں آئے اور ان کے ہاتھ پر حضرت حسینؑ کے لئے بیعت کرنے لگے۔ چنانچہ بارہ ہزار اشخاص نے بیعت کر لی۔ دریں اثنا یزید کے ایک کارندہ عبداللہ بن مسلم بن شعبہ حضرمی کو اس کا پتہ چلا تو اس نے ساری کارروائی کی اطلاع نعمان بن بشیر گورنر کوفہ کو دے دی اور ساتھ ہی کہا یا تو آپ واقعہ کمزور ہیں یا کوفہ والوں نے آپ کو کمزور سمجھ رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں کہ شہر کی صورتِ حال مخدوش ہو رہی ہے؟ اس پر حضرت نعمان نے فرمایا کہ میری ایسی کمزوری جو بر بنائے اطاعتِ الہی ہو وہ مجھے اس قوت و طاقت سے زیادہ پسند ہے جو اس کی معصیت میں ہو، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ جس امر پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈالے رکھا ہے خواہ مخواہ اس پردہ کو فاش کروں۔ اس پر عبداللہ مذکور نے یہ سارا ماجرا یزید کو لکھ کر بھیج دیا۔ یزید نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سرجون نامی سے اس بارے میں مشورہ لیا۔ اس نے کہا ”اگر آپ کے والد زندہ ہوتے

اور آپ کو کوئی مشورہ دیتے تو اسے قبول کرتے۔“ یزید نے کہا ضرور! سرحدوں نے کہا تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کوفہ کی گورنری عبید اللہ بن زیاد کے سپرد کریں۔ ادھر صورت حال ایسی تھی کہ ان دنوں یزید عبید اللہ کو رپرنا راض تھا۔ اور بصرہ کی گورنری سے بھی اسے معزول کرنا چاہتا تھا۔ مگر سرحدوں کے مشورے پر اس نے اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری پر بھی عبید اللہ بن زیاد کو نامزد کر دیا اور لکھ دیا کہ کوفہ پہنچ کر مسلم بن عقیل کو تلاش کرو اگر مل جائے تو اس کو قتل کر دو۔

ابن زیاد کوفہ میں واپس آئے

اس حکم کی بنا پر عبید اللہ بصرہ کے چند سرکردہ لوگوں کے ہمراہ اس حالت میں کوفہ پہنچا کہ اس نے ڈھانٹا باندھ رکھا تھا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے وہ اہل کوفہ کی جس مجلس سے گزرتا اس پر سلام کرتا اور وہ حضرت حسینؑ سمجھ کر وعلیک السلام یا ابن رسول اللہ کے بیٹے آپ پر بھی سلام سے جواب دیتے۔ اسی طرح سلام کہتا اور جواب لیتا ہوا وہ قصرِ امارت میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک غلام کو تین ہزار درہم دیے اور کہا کہ تم جا کر اس شخص کا پتہ لگاؤ جو کوفہ والوں سے بیعت لیتا ہے۔ لیکن دیکھو تم خود کو ”حمص“ کا باشندہ ظاہر کرنا اور یہ کہنا کہ میں بیعت کرنے کے لئے آیا ہوں اور یہ رقم بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے مشن کی تکمیل میں اس کو صرف کریں۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور بہ لطائف الجیل اس شخص تک اس کی رسائی ہو گئی جو بیعت لینے کا اہتمام کرتا تھا۔ اور اس نے اپنے آنے اور امدادی رقم پیش کرنے کی سب بات کہہ ڈالی۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تمہیں ہدایت کا راستہ نصیب ہوا لیکن مجسوس کر کے دکھ بھی ہو رہا ہے کہ ہماری اسکیم ابھی پختہ نہیں ہوئی۔ تاہم وہ اس غلام کو حضرت مسلم بن عقیل کے ہاں لے گیا۔ حضرت مسلم نے اس سے بیعت بھی لے لی۔ اور رقم بھی اس سے قبول کر لی۔ اب وہ یہاں سے نکلا اور

عبداللہ بن زیاد کے پاس سیدھا پہنچا اور سب کچھ اس کو بتلادیا۔ ادھر حضرت مسلم علیہ اللہ کی کوفہ میں آمد کے بعد عوسجہ کا گھر چھوڑ کر ہانی بن عروہ مرادی کے مکان پر فرزند کش تھے اور حضرت حسینؑ کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ بارہ ہزار کی تعداد میں ہماری لوگوں نے بیعت کر لی ہے، آپ کوفہ تشریف لے آئیں۔

اور یہاں یہ ہوا کہ جب عبداللہ کو پتہ چل گیا کہ مسلم ہانی کے مکان پر ہیں تو اس نے کوفہ کے سرکردہ لوگوں سے کہا کہ کیا بات ہے ہانی میرے پاس نہیں آئے؟ اس پر حاضرین سے ایک شخص محمد بن اشعب چند ہمراہیوں کے ساتھ ہانی کے ہاں گئے تو وہ اپنے دروانے پر موجود تھے۔ ابن اشعب نے کہا کہ گورنر صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ اور آپ کے اب تک نہ حاضر ہونے کو بہت محسوس کرتے ہیں، لہذا آپ کو چلنا چاہیے۔ چنانچہ ان کے زور دینے پر ہانی ان کے ساتھ ہولتے اور وہ عبداللہ کے پاس پہنچے اور اتفاق سے اس وقت قاضی شریح بھی ابن زیاد کے پاس موجود تھے ان سے مخاطب ہو کر اس نے کہا دیکھو اس ہانی کی حال کھوٹ کی منظر ہے۔ پھر اتنے میں وہ اس کے پاس آ گیا تو کہا "ہانی! مسلم بن عقیل کہاں ہیں؟ اس نے کہا مجھے علم نہیں، اس پر عبداللہ نے تین ہزار روپے والے غلام کو اس کے سامنے کر دیا، ہانی بالکل لاجواب ہو گئے، البتہ اتنا کہا کہ میں نے انہیں اپنے گھر بلا یا نہیں بلکہ وہ خود میرے گھر آ کر ٹھہر گئے ہیں، ابن زیاد نے کہا اچھا ان کو حاضر کرو۔ اس نے اس پر پس و پیش کیا تو ابن زیاد نے ان کو اپنے قریب منگا کر اس کے زور سے چھڑی ماری جس سے اس کی بھویں پھٹ گئیں۔ اس پر ہانی نے اس کے ایک محافظ سپاہی سے تلوار چھین کر عبداللہ پر وار کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا، اس پر ابن زیاد نے یہ کہہ کر کہ اب تمہارا خون حلال ہے قصر امارت کے ایک حصے میں اس کو قید میں ڈال دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع ہانی کے قبیلہ مذحج کو ہوئی تو اس نے قصر امارت پر بیغار بول دی۔ عبداللہ نے شور سنا اور پوچھا تو کہا گیا ہانی کا قبیلہ انکو چھڑانے

کے لئے چڑھ آیا ہے۔ اس نے قاضی شریح کے ذریعے ان کو کہلایا کہ ہانی کو مسلم بن عقیل کا پتہ کرنے اور بعض باتوں کی تحقیق کے لئے روک لیا گیا ہے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ساتھ ہی قاضی شریح پر بھی ایک غلام کو لگا دیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ لوگوں سے کیا کہتے ہیں؟ قاضی شریح لوگوں کی طرف جاتے ہوئے ہانی کے پاس سے گزے تو اس نے قاضی صاحب سے کہا کہ میرے بارے میں اللہ سے ڈرنا، ابن زیاد میرے قتل کے درپے ہے۔ تاہم قاضی شریح نے ہجوم کو ابن زیاد والی بات کہہ کر مطمئن کر دیا، اور لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ ہانی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

حضرت مسلم کو جب ہنگامہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ذرائع ابلاغ سے کوفہ میں اعلان کرادیا جس کے نتیجے میں چالیس ہزار لوگ ان کے پاس جمع ہو گئے۔ جن کو باقاعدہ انہوں نے ایک فوجی دستہ کی شکل دے دی جس کا مقدمہ الجیش میمنہ اور میسرہ وغیرہ سمجھی کچھ تھا۔ خود حضرت مسلم بن عقیل اس کے قلب میں ہو گئے۔ اس طرح چالیس ہزار کا یہ لشکر حبرہ اور قصر امارت کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبید اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اہالیساں کوفہ کو اپنے قصر میں بلایا۔ جب یہ لشکر قصر امارت تک پہنچ گیا تو سرداران کوفہ نے اپنے اپنے قبیلے کو دیواروں کے اوپر سے گفتگو کر کے سمجھانا شروع کیا۔ اب تو مسلم کی فوج کے آدمی کھسکنے شروع ہوئے اور ہوتے ہوتے شام تک صرف پانچ سو رہ گئے۔ حتیٰ کہ رات کے اندھیرے تک وہ بھی چل دیتے۔ جب حضرت مسلم نے دیکھا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ بھی وہاں سے چل پڑے۔ راستہ میں ایک مکان کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خاتون اندر سے آپ کی طرف نکلی تو آپ نے اس کو پانی پلانے کے لئے کہا تو اس نے پانی تو پلا دیا لیکن اندر واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر باہر آئی تو آپ کو دروازے پر دیکھ کر اس نے کہا اے اللہ کے بندے! آپ کا اس طرح بیٹھنا مشکوک ہے یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے کہا میں مسلم بن عقیل ہوں، کیا تم مجھے پناہ دو گی۔ اس نے کہا ہاں آجائیے۔ آپ اندر چلے گئے۔

لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس عورت کے لڑکے نے محمد بن اشعث مذکور کو اطلاع دے دی جس نے فوراً عبید اللہ تک خبر پہنچائی۔ جس نے اس کے ہمراہ پولیس کو روانہ کر دیا اور ان کو مسلم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ پولیس نے جا کر مکان کا محاصرہ کر لیا جب کہ مسلم کو خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ اب خود کو انہوں نے محصور پایا تو تلوار سونت کر نکل آئے اور پولیس کے مقابلہ کی ٹھان لی۔ لیکن ابن اشعث نے ان کو روک کر کہا کہ میں ذمہ دار ہوں آپ محفوظ رہیں گے۔ پس وہ حضرت مسلم کو ابن زیاد کے پاس پکڑ کر لے گئے۔ چنانچہ ابن زیاد کے حکم سے نہیں قصر امارت کی چھت پر لے جا کر قتل کر دیا گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ان کی لاش بازار میں لوگوں کے سامنے پھینک دی گئی۔ نیز اس کے حکم سے ہانی کو کوڑے کرکٹ کی جگہ تک گھسیٹتے ہوئے لے جا کر سولی دے دی گئی ادھر تو کوفہ میں یہ تک ہو گیا تھا اور

حضرت حسینؑ کی کوفہ روانگی

ادھر حضرت مسلم چونکہ خط لکھ چکے تھے کہ بارہ ہزار اہل کوفہ نے بیعت کر لی ہے حضرت حسینؑ جلد از جلد تشریف لے آئیں۔ حضرت حسینؑ مکہ شریف سے کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تا آنکہ آپ قادسیہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھے کہ حُر بن یزید تمیمی حضرت حسینؑ کے قافلہ کو ملا۔ اس نے کہا کہاں تشریف لے جا رہے ہو آپ نے فرمایا کوفہ، اس نے کہا کہ وہاں تو کسی خیر کی توقع نہیں آپ کو یہاں سے ہی واپس ہو جانا چاہیے۔ پھر کوفیوں کی بے وفائی اور حضرت مسلم کے قتل کی پوری روداد آپ کو سنائی۔

سارا قصہ سن کر حضرت حسینؑ نے تو واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن مسلم کے بھائیوں نے یہ کہہ کر واپس جانے سے انکار کر دیا کہ ہم مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود مارے جائیں گے۔ اس پر حضرت حسینؑ نے فرمایا تمہارے بغیر میں جی کر کیا کروں گا۔ اب وہ سب کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ کو ابن زیاد کی فوج کا ہراول دستہ نظر آیا تو آپ نے ”کر بلا“ کا رخ کر لیا۔ اور

وہاں جا کر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں ایک ہی طرف سے جنگ کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ خمیر نصب کر لئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ پینتالیس سوار اور سواروں کے قریب پیدل تھے۔

دریں اثنا عبید اللہ نے عمرو بن سعد کو جو کوفے کا گورنر تھا بلایا اور اس سے کہا کہ اس شخص کے معاملے میں میری مدد کریں اس نے کہا مجھے تو معاف ہی رکھتے، ابن زیاد نہ مانا۔ اس پر عمرو بن سعد نے کہا ”پھر ایک شب سوچنے کی مہلت تو دے دیجئے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ سوچ لو۔ ابن سعد نے رات بھر سوچنے کے بعد آمادگی کی اطلاع دے دی۔

اب عمرو بن سعد حضرت حسین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دیکھو تین باتوں میں سے ایک بات منظور کر لو (۱) یا مجھے کسی اسلامی سرحد پر چلے جانے دو (۲) یا مجھے موقعہ دو کہ میں براہ راست یزید کے پاس پہنچ جاؤں (۳) اور یا پھر یہ کہ جہاں آباہوں وہیں واپس چلا جاؤں۔ ابن سعد نے یہ تجویز خود منظور کر کے ابن زیاد کو بھیج دی۔ اس نے لکھا ہمیں یہ منظور نہیں ہے (بس ایک ہی بات ہے کہ) حسینؑ (یزید کیلئے) میری بیعت کریں۔ ابن سعد نے یہی بات حضرت حسینؑ تک پہنچا دی۔ انہوں نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر آپس میں لڑائی چھڑ گئی اور حضرت کے سب ساتھی (منظومانہ) شہید ہو گئے جن میں دس سے کچھ اوپر نوجوان ان کے گھر کے تھے۔ اسی اثنا میں ایک تیرا یا جو حضرت کے ایک چھوٹے بچے کو لگا جو گود میں تھا۔ آپ اس سے خون پونچھ رہے تھے اور فرماتے تھے ”رأى اللہ! ہمارے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فیصلہ فرما جنہوں نے پہلے یہ لکھ کر ہمیں بلایا ہے کہ ہم آپ کی مدد کریں گے۔ پھر اب وہی ہمیں قتل کر رہے ہیں۔“ اس کے بعد خود تلوار ہاتھ میں لی، سردانہ وار مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے رضی اللہ عنہ، اور یہ شخص جس کے ہاتھ سے حسینؑ شہید ہوئے قبیلہ مذحج کا آدمی تھا، اگرچہ اس بارے میں دوسرے اقوال بھی تاریخوں میں مذکور ہیں۔

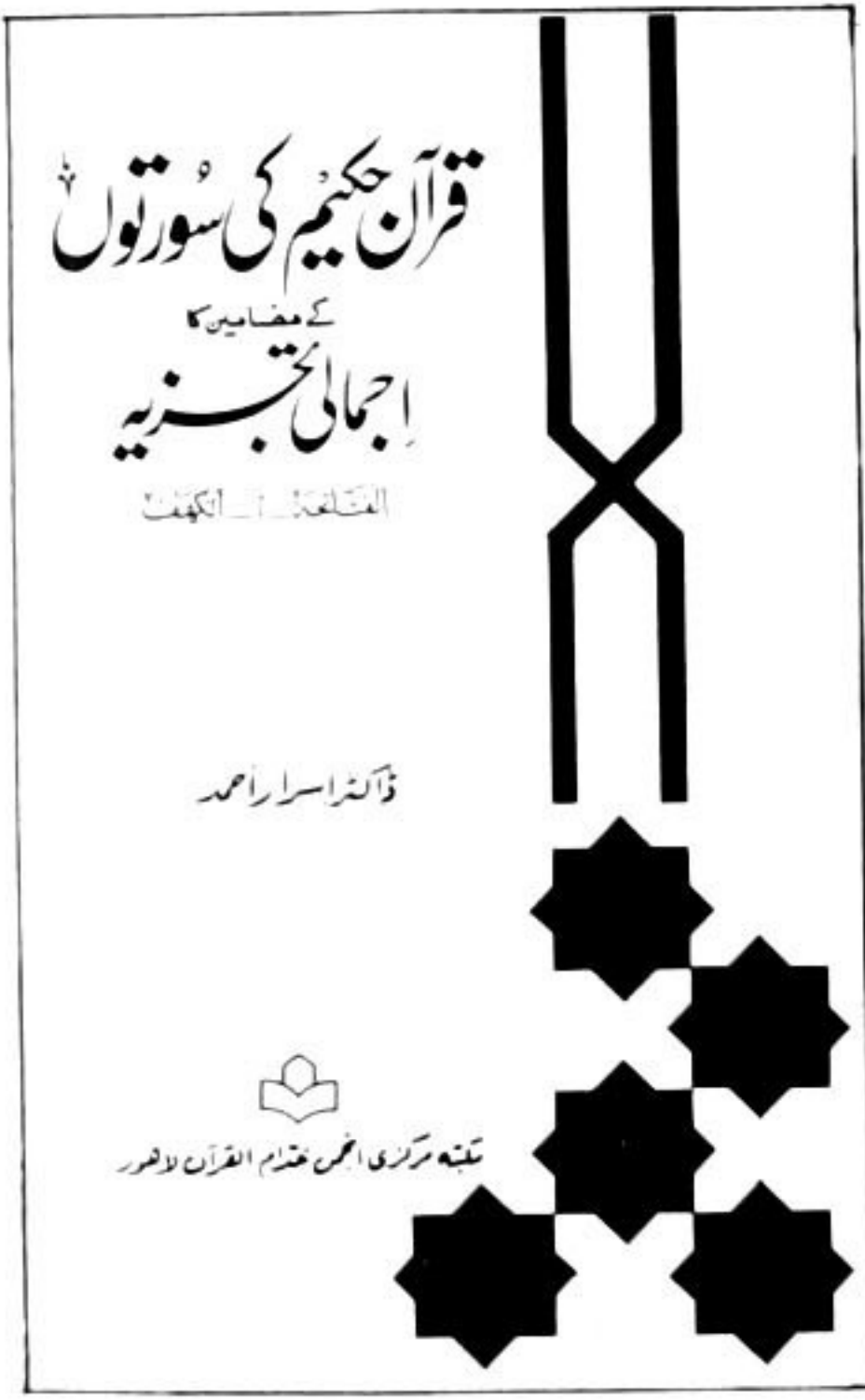
مذحج ہانی کا وہی قبیلہ تھا، جس نے قصر امارت پر چڑھائی کر دی تھی۔ یہ شخص حضرت کاسر تن سے جدا کر کے ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ اس نے اس شخص کو آپ کا سر مبارک دے کر یزید کے پاس بھیج دیا۔ جہاں جا کر یزید کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ادھر ابن سعد بھی حضرت کے گھر دار کو لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچ گیا اور ان کا صرف ایک لڑکا بچا رہ گیا تھا اور وہ بچہ علی بن الحسین زین العابدین تھے اور روایت کے راوی ابو جعفر، الباقر کے والد تھے۔ یہ عورتوں کے ساتھ اور بیمار تھے۔ ابن زیاد نے حکم دیا، اس بچے کو بھی قتل کر دیا جائے۔ اس پر ان کی پھوپھی زینب بنت علی رضی اللہ عنہا کے اوپر گر پڑیں، اور فرمایا کہ جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں گی اس بچے کو قتل نہ ہونے دوں گی۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ابن زیاد نے اپنا یہ حکم واپس لے لیا اور بعد میں امیران جنگ کو یزید کے پاس بھیج دیا۔

جب حضرت حسین کے بچے کھچے یہ افراد خانہ یزید کے دربار میں پہنچے تو چند درباریوں نے حسب دستور یزید کو تہنیت فتح پیش کی۔ ان میں سے ایک شخص نے یہاں تک جسارت کر ڈالی کہ ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا، امیر المؤمنین! یہ مجھے دے دیجئے۔ یہ سن کر حضرت زینب بن علی نے کہا بخدا! یہ نہیں ہو سکتا، بجز اس صورت کے کہ یزید دین الہی سے نکل جائے۔ پھر اس شخص نے دوبارہ کہا تو یزید نے اسے ڈانٹ دیا۔

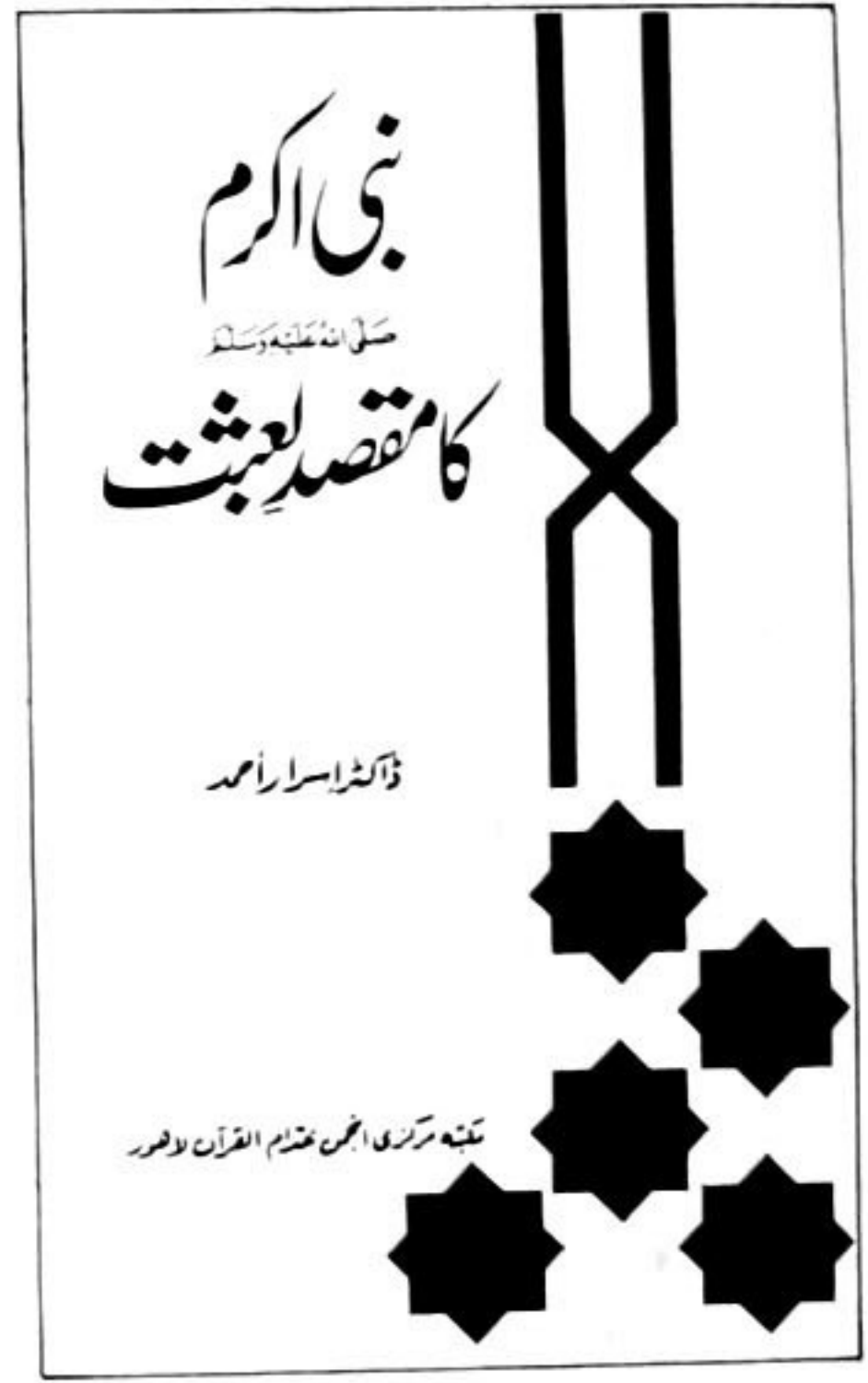
اس کے بعد یزید نے ان سب کو محل سرا میں بھیج دیا۔ پھر ان کو تیار کر کے مدینہ روانہ کروا دیا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو خاندان عبدالمطلب کی ایک عورت سرپٹتی اور روتی ہوئی ان سے ملنے کے لئے آئی اور اس کی زبان پر یہ اشعار تھے۔

ماذا نقولون ان قال البني لکم	ماذا فعلتم وانتم اخرا لامم
بعترتی و باہلی بعد مفتدی	منہم اساری و قلی ضر جوا بدم
ماکان هذا جزائی اذ نصحت لکم	ان تخلفونی بشر فی ذوی رحمی

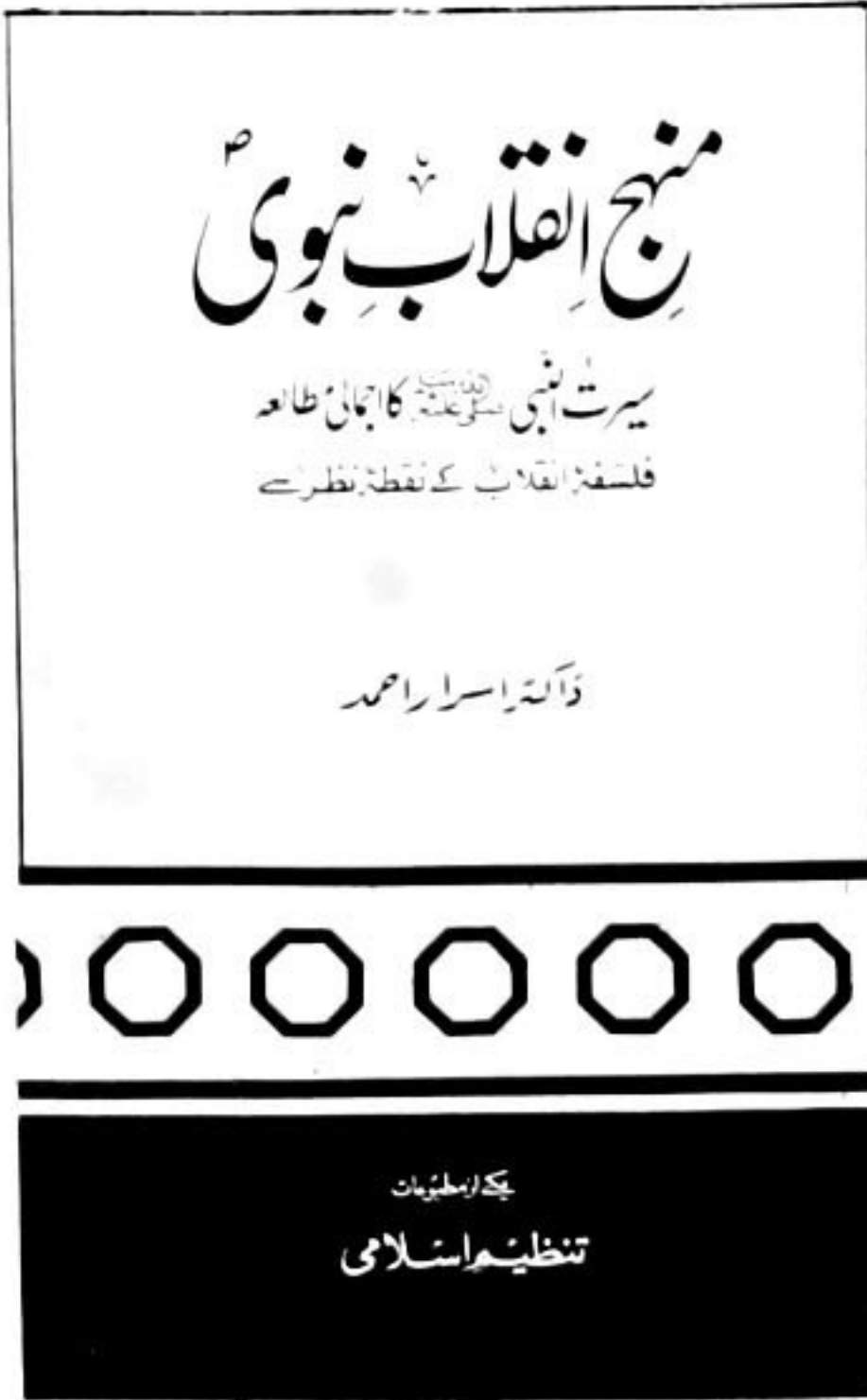
(اس روایت کو حافظ ابن حجر العسقلانی نے "تہذیب التہذیب" میں نقل کیا ہے)



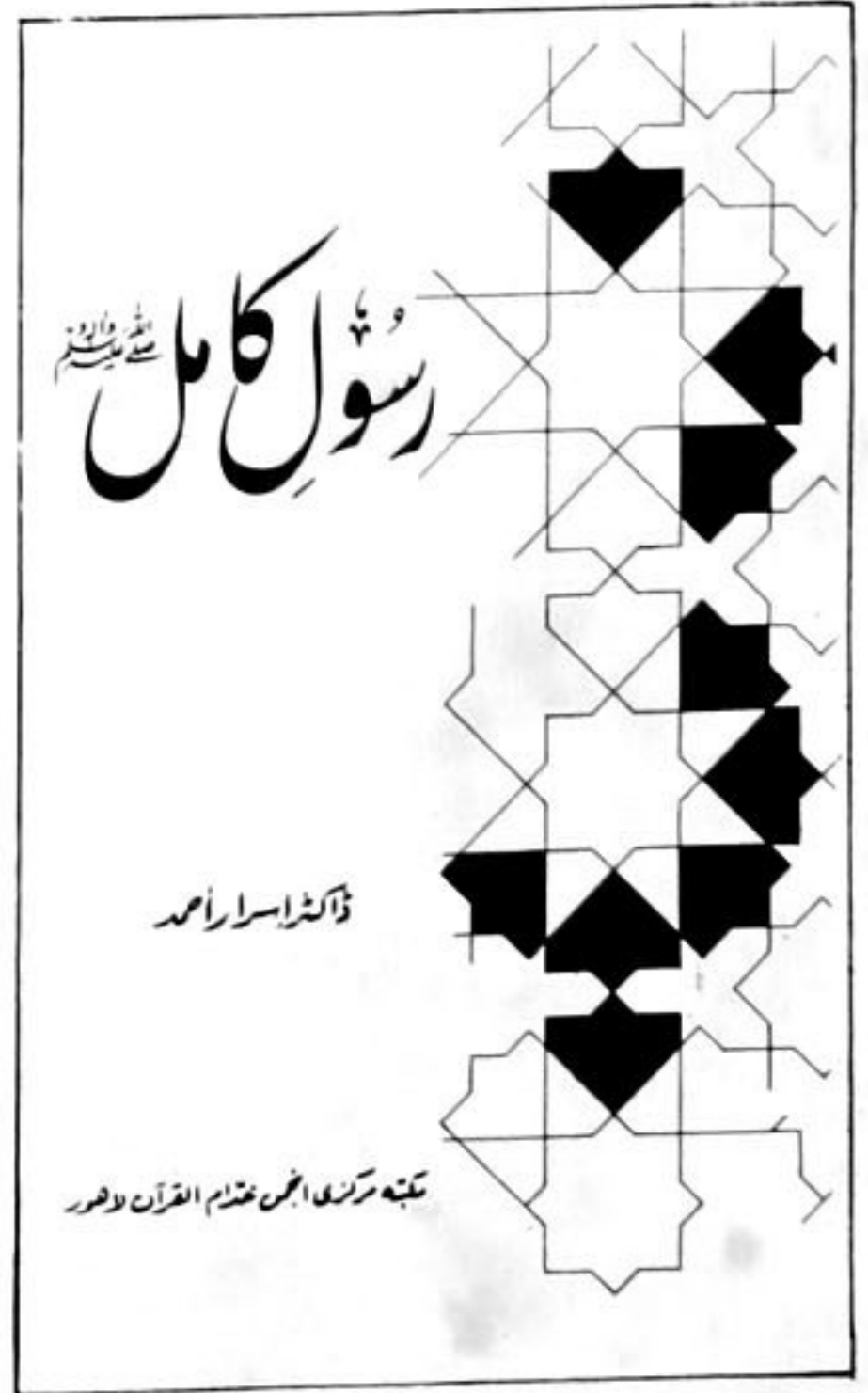
اشاعتِ خاص - ۴۰/- روپے، عام - ۲۰/- روپے



اشاعتِ خاص - ۲۰/- روپے، عام - ۶/- روپے



اشاعتِ خاص - ۶۰/- روپے، عام - ۳۰/- روپے



اشاعتِ خاص - ۱۲/- روپے، عام - ۵/- روپے

راہِ بَشْتَنَدِ اَعْمَنِ اَبَانِ اِسْرَہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

نبی ایمان — اور — سرِ شہیدِ نقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکرانت کے فیہ عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک پاہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو کے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ